شرح
الأربعين النووية

حدیث نمبر۳ "اسلام پانچ [ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے"

حدیث نمبر۴ "تخلیقِ انسان"

تشریح (انگریزی)

جمال الدین زرابوزو

ترجمہ زیرِ نگرانی

حکیم نعیم الدین زبیری (ندوی)

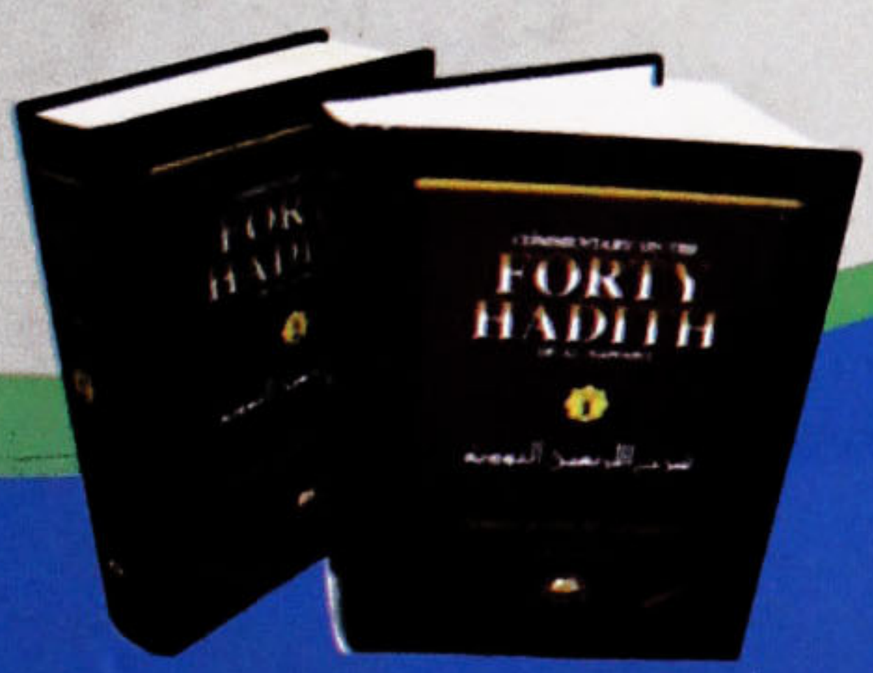

مترجم

سیّد فراست شاہ

Marfat.com

شرح

الأربعين النووية

حدیث نمبر3

"اسلام پانچ [ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے"

حدیث نمبر۴

"تخلیقِ انسان"

تشریح (انگریزی)

جمال الدین زرابوزو

ترجمہ زیرِ نگرانی

حکیم نعیم الدین زبیری (ندوی)

مترجم

سیّد فراست شاہ

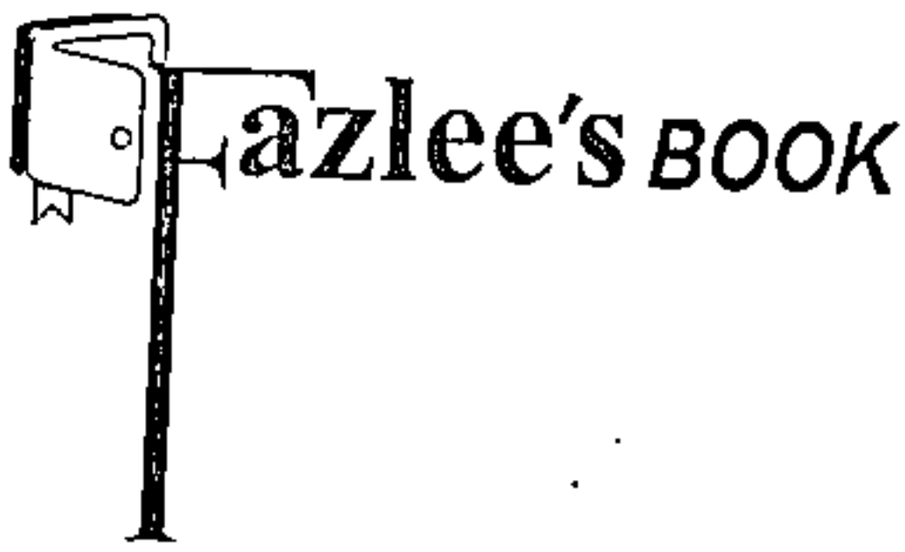

Marfat.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

نام کتاب	:	الأربعين النووية
مترجم	:	سیّد فراست شاہ
پیشکش	:	Fazlee's BOOK SUPERMARKET
اشاعت	:	2015

تقسیم کار

فضلی بک سُپر مارکیٹ

نزد ریڈیو پاکستان، اردو بازار، کراچی۔

(92-21) 32629724, 32212991

e-mail: fazleepublisher@gmail.com

website: www.fazleebooks.com

کتاب سرائے

فرسٹ فلور الحمد مارکیٹ، غزنی اسٹریٹ،

اردو بازار ،لاہور۔

(92-42) 37320318

کتاب گھر

کمیٹی چوک، راولپنڈی۔

(92-51) 5552929, 5539609

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیم

تعارف

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن!

آپ جس کام کا مطالعہ کرنے جارہے ہیں وہ امام النووی کی اربعین پر محترم جمال الدین زرابوزو کی انگریزی میں لکھی گئی شرح کے اردو ترجمے کا حصہ ہے، جسے راقم نے محترم حکیم نعیم الدین زبیری ؒ کے زیرِ نگرانی مکمل کیا۔ یہ کتاب اس سلسلے کی تیسری اور چوتھی حدیث کی تشریح پر مبنی ہے، بیالیس(42)احادیث پر مشتمل اربعین نووی کی انگریزی میں لکھی گئی اس شرح کا مکمل ترجمہ ادارہ تحقیقاتِ اسلامی(IRI) انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے زیر انتظام تدوین کے مراحل میں ہے اور ان شاءاللہ عنقریب اشاعت کے لیے تیار ہوجائے گا۔ مترجم کے نہایت قابلِ احترام دوست اور کرم فرماڈاکٹر سہیل حسن صاحب کی ہدایت پر اربعین کی احادیث کی اس تشریح پر مبنی آن لائن کورسس مترجم کی زیرِ نگرانی تشکیل دیئے جارہے ہیں جو مستقبل قریب میں دعوۃ اکیڈمی کے آن لائن کورسس میں شامل ہوجائینگے۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

ڈاکٹر سہیل حسن صاحب آجکل دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد میں ڈائریکٹر جنرل کے فرائض انجام دے رہے ہیں اور خود ایک معروف عالمِ دین ہیں۔ مترجم اپنے کام پر ڈاکٹر صاحب کے اس اعتماد اور ہمت افزائی کے لیے شکر گزار ہے۔

اربعین کو مرتب کرنے والے مُحی الدین ابو زکریا یحییٰ ابنِ شرف الحزامی النووی اپنی جائے پیدائش النوا کے تعلّق سے النووی کے نام سے مشہور ہیں۔ النوا شہر دمشق کے جنوب میں واقع ایک قصبہ تھا جہاں امام النووی کی ولادت 631 ہجری بمطابق 1233 عیسوی میں ہوئی۔ ساتویں صدی ہجری کے اس مشہور عالمِ دین نے اپنی اربعین کے لیے جن احادیث کا انتخاب کیا وہ دینِ اسلام

Marfat.com

کے تقریباً سارے ہی امور کا احاطہ کرتی ہیں۔ النووی اپنے اس کام کے بارے میں لکھتے ہیں، ''ہر ایسے شخص کے لیے جو آخرت کاخواہشمند ہے اور اُسے اپنے پیشِ نظر رکھتاہے ضروری ہے کہ وہ ان احادیث سے مانوس ہوکیونکہ یہ دین کے اہم ترین اُمور کا احاطہ کرتی ہیں اور اللہ کی اطاعت کی تمام راہوں کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ یہ حقیقت ہر اس شخص پر آشکار ہوجاتی ہے جو ان احادیث پر غوروفکر کرتاہے۔''

ان احادیث کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتاہے کہ چالیس احادیث پر مشتمل مجموعے کئی اشخاص نے مرتّب کیے لیکن آج بھی جب اربعین یا چہل حدیث کہا جاتاہے تو اُس سے مراد النووی کا مجموعہ ہی لیاجاتاہے۔اس مجموعے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتاہے کہ اس کی متعدّد تشریحات لکھی گئیں۔ دورِ جدید میں اردو زبان میں لکھی گئی تشریحات میں مولانا محمد عاشق الٰہی، پروفیسر سعید مجتبیٰ صدیقی اور مولانا امیر الدین مہر کی کاوشیں شامل ہیں جن میں ان احادیث کی مختصر تشریح پیش کی گئی ہے۔

محترم جمال الدین زرابوزو نے انگریزی زبان میں اربعین نووی کی ایک مفصّل تشریح تصنیف کی ہے۔ محترم زرابوزو امریکی شہری ہیں اور آج کل امریکی ریاست کیلیفورنیا میں مقیم ہیں آپ سن 1960 میں ایک رومن کیتھولک گھرانے میں پیدا ہوئے۔ حق کی تلاش نے انہیں راہِ راست پر ڈال دیا جہاں حق تعالیٰ کی رحمت ان کی منتظر تھی اور یوں وہ سولہ(16)برس کی عمر میں مشرّف بہ اسلام ہوئے۔ معاشیات میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی اور اسی مضمون میں ڈاکٹریٹ کے کام کو مکمل نہ کیا اور حُصولِ علم دین میں لگ گئے۔ کئی کتابیں تصنیف کیں، امام النووی کی اربعین پر ان کی تشریح ایک معرکۂ آراء تحقیقی کام ہے۔ حدیث کے مختلف پہلوؤں

Marfat.com

پر گہری تحقیق کے بعد ہی ایسا کام ممکن ہوسکتا ہے۔ دیگر امتیازی خصوصیات کے علاوہ اس کام کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں دورِ حاضر کے معاملات کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔اس تشریح کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس میں استعمال کیے گئے تقریباً تمام تر مواد کے لیے تفصیلی حوالے دیئے گئے ہیں۔

مترجم پیشے کے اعتبار سے ماہر طبیعات الارض (Geophysicist) ہے، تاہم اسلامی فکر اور احیائے اسلام کی عملی جدّو جہد سے طویل وابستگی اور اہلِ علم سے تعلق کی بنا پر مسلسل علومِ دین کا طالب رہا۔ زندگی کا ایک لمبا عرصہ امریکہ میں گزارا اور وہیں شیخ جمال الدین زرابوزو سے متعارف ہوا۔ بشمول اِس کتاب کے جس کا ترجمہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی، مصنف کی کئی اور کتابیں پڑھ کر اور تقاریر سن کر بہت فیض حاصل کیا۔ مترجم کی رائے میں دورِ جدید میں اردو زبان میں کئی معرکۂ آراء کتابیں دینِ اسلام کے کئی موضوعات پر ایسی لکھی گئی ہیں جو دیگر زبانوں مثلاً، انگریزی وغیرہ میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں۔ تاہم، انگریزی زبان میں بھی ماضیٔ قریب میں چند نہایت عمدہ کتابیں اسلامی موضوعات پر لکھی گئی ہیں جو اردو اور دیگر زبانوں میں ترجمہ کرنے کے لائق ہیں اور ان کتابوں میں جو سرفہرست ہیں ان میں محترم جمال الدین زرابوزو کی یہ شرح ہے جو انہوں نے امام النووی کی اربعین پر لکھی۔ مترجم کے مربّی اوراستاد محترم حکیم نعیم الدین زبیری نے مترجم کے اس خیال سے اتفاق کیااور شفقت کی کہ اس کام کی نگرانی فرمائیں۔ اس شرح کی ایک بہت اہم حدیث "اسلام پانچ [ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے" کا ترجمہ فضلی بکس کے زیرِ انتظام شائع کیا جارہا ہے۔ دیگر احادیث بھی بالترتیب شائع کی جائیں گی۔

محترم حکیم نعیم الدین زبیری مترجم کے اس کام میں نہ صرف معاون ومددگار تھے بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کے حوصلہ دیئے بنا مترجم کے لیے اس کام کو

Marfat.com

پایۂ تکمیل تک پہنچانا ممکن نہ ہوتا۔ حکیم صاحب ندوۃ العلوم لکھنو سے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ماہر حکیم بھی تھے۔ سن2012ء میں اپنی وفات تک ہمدرد یونیوسٹی سے وابستہ رہے جہاں وہ تاحیات اسکالر کے مقام پر فائز تھے۔ حکیم سعید کے قریبی ساتھی اور معاونِ کار رہے۔ حکیم صاحب اپنی علالت کے باوجود دو سال سے زیادہ کے عرصے تک مسلسل اس کام کی نگرانی کرتے رہے۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت کرے۔ اس کام کے دوران میں نے ایسے ہی کئی دعائیہ کلمات کئی بار ان کی زبان سے محترم جمال الدین زرابوزو کے بارے میں سُنے۔ اللہ ان سب افراد کو جن کا اس کام میں جس قدر بھی حصہ ہے۔ اپنی بیش بہا نعمتوں اور رحمتوں سے نوازے۔

ترجمے کے ہر کام میں اصل تحریر کے مقابلے میں کچھ نہ کچھ کمی بیشی رہ جانا ایک فطری بات ہے۔ اس ترجمے کے دوران حتّی المقدور اس بات کی دانستہ کوشش کی گئی ہے کہ اصل تحریر سے قریب تر رہا جائے۔ تاہم، بعض مقامات پر مترجم نے خود یا محترم حکیم نعیم الدین زبیریؒ کے مشورے کے مطابق کچھ مختصر نوٹ وضاحت کے لیے ضروری سمجھے، یہ جملے اور نوٹ خمیدہ بریکیٹ{ } میں رکھے گئے ہیں تاکہ پہچانے جائیں۔ اس تحریر میں قرآنی آیات کے تراجم سیّد مودودی کے ترجمۂ قرآن سے لیے گئے ہیں۔ احادیث کے تراجم میں اصل الفاظ سے قریب تر رہتے ہوئے مفہوم پیش کیے گئے ہیں لہٰذا، انہیں تراجم کے بجائے مفہوم ہی سمجھا جائے، اوکماقال رسول اللہ ﷺ۔

میں فضلی بکس کراچی کا ممنون ہوں جس ادارے کے توسط سے یہ کتاب آپ تک پہنچ رہی ہے۔ یہ تعارف مکمل نہیں ہوگا اگر اس میں دو ایسے اشخاص کا ذکر نہ کیا جائے جن کا اس کام کی تکمیل میں اہم کردار ہے۔ محترم معظّم علی قادری

Marfat.com

(مرحوم)اللہ ان پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے جنہوں نے اپنے دفتر میں کام کرنے والے ثاقب شاہ کی خدمات ٹائپنگ کے کام کے لیے پیش کیں۔ ثاقب شاہ نے نہ صرف ٹائپنگ کا کام حسنِ خوبی سے انجام دیا بلکہ اس کام کے دوران کئی مقامات پر اپنی بہترین فنّی رائے سے نوازا، دوسرے مددگار مولانا اصغر، مولانا فضل اکبر اور حافظ محمد عظیم ہیں جنہوں نےا س کام کی نوک پلک درست کرنے میں معاونت فرمائی، میں ان اشخاص کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔

مترجم

سیّد فراست شاہ

1رمضان المبارک1436ھ بمطابق2015ء

Marfat.com

حدیث نمبر ۳

”اسلام پانچ [ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے“

Marfat.com

فہرستِ مضامین

دیباچہ 11

حدیث نمبر3 اسلام پانچ [ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے 13

منتخب عربی الفاظ اور معنی 13

تخریج 14

اس حدیث پر ایک جامع تبصرہ 14

راوی عبد اللہؓ ابنِ عمرؓ ابنِ الخطاب 15

"اسلام چار[ستونوں]پر تعمیر ہوا ہے" 16

"شہادت دینا کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے" 18

لاالٰہ الا اللہ کی شرائط 18

محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں 31

اُس کے بارے میں حکم جس نے شہادت سے انحراف کیا 39

ایمان کی دوسری شاخوں کا کیا معاملہ ہے؟ 39

"نماز قائم کرو" 40

صلوٰۃ("نماز") کے معنیٰ 40

"نماز قائم کرنے" کے معنی 42

نماز کی اہمیت 47

نماز نہ پڑھنے والے کے متعلّق حکم 52

"زکوٰۃ ادا کرنا" 56

Marfat.com

زکوٰۃ کے معنی 56
زکوٰۃ کی اہمیت 57
اس کے بارے میں حکم جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا 63
"اللہ کے گھر کا حج کرنا" 65
حج کے معنی 65
حج کی اہمیت 66
حج اس پر فرض ہے جو اسکی استطاعت رکھتا ہے 69
حج کو مؤخّر کرنے کا مسئلہ 70
ایسے شخص کے بارے میں حکم جس کی موت اس حالت میں ہوئی کہ
اس نے حج ادا نہیں کیا، اسکے باوجود کہ وہ اسکی استطاعت رکھتا تھا 72
"ماہِ رمضان کے روزے رکھنا" 73
روزے کے معنی 73
اس کے بارے میں حکم جو روزے نہیں رکھتا 76
جہاد کیا ہے 77
حدیث کا خلاصہ 80

Marfat.com

دیباچہ

بخاری اور مسلم کی صحیحین میں موجود اعلیٰ درجے کی اس حدیث میں اللہ کی عبادت کے اعمال کا ذکر ہے؛ جو جسمانی بھی ہیں جیسے زبان سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کا اقرار، نماز، روزہ؛ مالی بھی ہیں جیسے زکوٰۃ؛ جسمانی اور مالی عبادت کا امتزاج بھی جیسے حج۔ ان عبادات کو اس حدیث میں اسلام کی بنیادیں کہا گیا ہے اور انہیں ارکانِ اسلام کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

اسلام دراصل مجموعہ ہے اندرونی اعمال کا جیسے ایمان کی وہ شاخیں جن کا ذکر حدیثِ جبریل میں آچکا ہے اور ظاہری اعمال کا جن کا اس حدیث میں ذکر ہے، مذاہبِ عالم کے پیروکاروں کے اپنے مذاہب پر عمل پیرا ہونے کے انداز اور طور طریقوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے باطنی اور ظاہری اعمال کے درمیان توازن نہ رکھ سکے اور افراط و تفریط کا شکار ہو گئے۔ من جانب اللہ آئے ہوئے مذاہب میں یہ نقص نہیں ہو سکتا، دراصل یہ بعد کی اختراعات ہیں جن کا شکار ان مذاہب کے پیروکار ہوئے۔ مثلاً یہودی ظاہری پہلو میں جبکہ نصرانی باطنی پہلو میں افراط کا شکار ہوئے۔

مسلمانوں میں یہ بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں اور ہوئی ہیں۔ آپ ﷺ کے قول کے مطابق اگر اہلِ کتاب کسی سراغ سے بھی داخل ہو گئے تو مسلمانوں میں بھی ایسا کرنے والے پائے جائیں گے۔ لہٰذا، ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس قسم کے رجحانات کو پہچانے ان سے اجتناب کرے اور ایسی اختراعی راہوں پر چل نکلنے والے مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش کرے۔

جن بنیادی عبادات کا ذکر اس حدث مبارکہ میں آیا ہے ان میں اجتماعیت ایک اہم پہلو ہے۔ شہادتین کو صرف قلبی اقرار تک محدود نہیں رکھا گیا، بلکہ زبانی اقرار کے ذریعے اپنی

Marfat.com

پہچان کرانی ہے کہ میں اس امّتِ محمدی کا حصہ ہوں۔ نماز میں اجتماعیت، رمضان کے روزوں کا اہتمام تمام امّت میں ایک ساتھ کیا جانا، زکوٰۃ کے ذریعہ ایک دوسرے کی مدد کرنا، پھر زندگی میں ایک بار اس اجتماع گاہ میں حج کے لیے اکھٹے ہونا جہاں صاحب و محتاج و غنی ایک ہو جاتے ہیں۔ مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف رنگ و نسل کے اور مختلف علاقوں کے لوگ ہر سال منعقد ہونے والی اس روح پرور عبادت میں آپس میں مل جاتے ہیں، نہ جھگڑا ہے نہ فساد، بلکہ عفو ہے درگزر ہے محبت ہے ایثار ہے۔ اسلام کی بنیادی عبادات ہمیں کیا سبق دے رہی ہیں۔ یکجائیت کا اور اتحاد کا۔ کوئی فلسفہ، کوئی نظریہ اگر مسلمانوں میں تفریق پیدا کرتا ہے وہ اسلام سے سوا کوئی بھٹکا دینے والی راہ ہے۔

Marfat.com

حدیث نمبر3

اسلام پانچ [ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے

عَنْ أَبِيْ عَبْدِالرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰہُ عَنْہُما قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَيْہِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ: بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلَى خَمْسٍ: شَهَادَةِ أَنْ لَا إِلٰہَ إِلَّا اللّٰہُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ، وَإِقَامِ الصَّلَاةِ، وَإِيْتَاءِ الزَّكَاةِ وَحَجِّ الْبَيْتِ، وَصَوْمِ رَمَضَانَ۔ رَوَاہُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ۔

ابو عبدالرحمٰن عبداللہؓ ابنِ عمرؓ ابنِ خطاب سے روایت ہوا ہے کہ: میں نے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اسلام پانچ [ستونوں][1] پر تعمیر ہوا ہے: یہ اقرار کرنا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور یہ کہ محمّد اللہ کے رسول ہیں، نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، اُس کے گھر کا حج کرنا اور رمضان کے روزے رکھنا۔" (البخاری و مسلم)

منتخب عربی الفاظ اور معنی

عَنْہُما: "ان دونوں پر" یہ عبداللہؓ ابنِ عمرؓ اور ان کے والد عمرؓ ابنِ خطاب کیلئے ہے۔
بُنِيَ: "پر تعمیر کیا گیا"۔
عَلَى: "اوپر"۔

---

[1] ابراہیم اور جانسن ڈیویس (Jhonson-Davies) نے اس حدیث کے ترجمے میں یہ تبصرہ کیا ہے کہ "لفظ ستون عربی متن کا حصہ نہیں بلکہ اسے وضاحت کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ ستون (ارکان) اس تناظر میں ایک ایسی اصطلاح ہے جسے عمومی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔" ابراہیم اور جانسن ڈیویس، ص۔34، زیریں حاشیہ نمبر1، عبدالرزّاق سے آئی ہوئی روایت میں واضح طور پر "سہارے" یا "میخیں" آیا ہے۔ صحیح مسلم کی روایت میں، پانچ مؤنث کے طور پر آیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ارکان یا ستون کے لیے ہے جیسا کہ، ابنِ حجر، فتح، جلد1، ص۔72۔

Marfat.com

خَمْسٍ: "پانچ"۔

تخریج

یہ حدیث عبد اللہؓ ابنِ عمرؓ ابنِ خطاب سے کئی سلسلوں سے روایت ہوئی ہے۔ مُتعدّد کُتبِ احادیث میں یہ حدیث موجود ہے جن میں بخاری، مسلم، احمد، نسائی، ترمذی، بیہقی (ان کی تین مختلف کتابیں)، صحیح ابنِ خزیمہ، صحیح ابنِ حبّان، الطبرانی الکبیر اور دیگر کتب شامل ہیں۔ یہ حدیث جریر بنِ عبد اللہ البجالیؓ سے بھی روایت ہوئی ہے جو رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں۔ جریرؓ سے یہ حدیث الطبرانی نے صحیح سلسلے کے ساتھ اپنی کتاب میں محفوظ کی ہے۔[1]

اس حدیث پر ایک جامع تبصرہ

یہ ایک نہایت اہم حدیث ہے، کیونکہ یہ اللہ کی بندگی کے ظاہری پہلو سے متعلّقہ بنیادی اُمور کو وضع کرتی ہے۔ بندگی کی بنیادوں کو یوں تصوّر کیجئے کہ جیسے کسی عمارت کی بنیادیں ہیں۔ اگر ایک شخص ان بنیادوں پر مکمل توجّہ دے تو یہ سارے دین کیلئے استحکام کا باعث بنیں گی۔ دینِ اسلام کے دیگر اعمال اس عمدہ بنیادی ڈھانچے کی تکمیل اور اسکی تزئین و آرائش کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ان بنیادوں میں ہی کمزور ہو تو یہ کمزوری پوری عمارت کیلئے خطرہ بن جاتی ہے جیسا کہ آگے تشریح میں واضح کیا گیا ہے۔

---

1 دیکھیں، ابنِ محمد، ص ص۔ 59-57۔

Marfat.com

راوی عبد اللہؓ ابنِ عمرؓ ابنِ الخطاب

عبد اللہؓ ابنِ عمرؓ ابنِ الخطاب(10 قبلِ ہجری بمطابق613عیسوی۔ 73ہجری بمطابق 692عیسوی)عمرؓ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ آپؓ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نوجوان صحابی تھے۔اپنے والد عمرؓ ابنِ الخطاب کے ساتھ ہی ایمان لائے، غزوۂ بدر کے وقت بہت کم عمر تھے تاہم اسکے بعد ہونے والی تمام غزوات میں رسول اللہ ﷺ کے ہم رکاب رہے۔

آپؓ بہت نیک سیرت انسان تھے۔ان کے زمانے میں جو سیاسی چپقلش رہی عبد اللہؓ ابنِ عمرؓ نے اس سے کنارہ کشی اختیار کی۔ایک جیّد عالم ہونے کے ساتھ ساتھ وہ رسول اللہ ﷺ کی ہدایات اور انکے اطوار کی ہو بہو پیروی کی وجہ سے مشہور ہیں۔ مدینے میں ترویج پانے والی (امام مالک ابنِ انس کی فقہ)، فقہٗ مالکی پر عبد اللہؓ ابنِ عمرؓ کے دینی معاملات میں کیے ہوئے فیصلے اور انکا طرزِ عمل بہت گہرا اثر رکھتے ہیں۔ وہ "چار عبد اللہ" میں سے ایک کے طور پر مشہور ہیں۔ جنہوں نے اسلام کے اولین دور میں دینی تعلیم کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔(باقی تین؛ عبد اللہ ابنِ عباس، عبد اللہ ابنِ عمرو بن العاص اور عبد اللہ ابنِ زبیر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ہیں)۔ آپؓ نے شمالی افریقہ کے جہاد میں بھی حصہ لیا۔

آپؓ کے متعلق مشہور ہے کہ حدیث سناتے وقت آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ روایتِ حدیث میں آپؓ کا مقام بہت نمایاں ہے اور اس سلسلے میں سب سے مشہور صحابی ابو ہریرہؓ کے بعد آپؓ ہی کا نام آتا ہے۔ تقریباً 2630احادیث آپؓ کی سند سے روایت ہوئی ہیں۔ ان کے اہم شاگردوں میں سعید ابنِ مسیبؒ، حسن البصری، زہری، محمد ابنِ سیرین اور نافع وغیرہ شامل ہیں۔

Marfat.com

اپنی زندگی کے آخری حصے میں آپؓ نابینا ہوگئے تھے۔ آپؓ کے متعلّق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آپؓ مکہ میں وفات پانے والے آخری صحابی تھے۔

”اسلام چار [ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے“

یہاں رسول اللہ ﷺ نے ایک تمثیل کا استعمال کرتے ہوئے اسلام کو ایک گھر کے طور پر بیان فرمایا، اس گھر کی پانچ بنیادیں ہیں اگر اس گھر میں یہ بنیادیں موجود نہیں تو در حقیقت گھر کا سرے سے وجود ہی ممکن نہیں۔ اسلام کے باقی اعمال طُفیلی حیثیت رکھتے ہیں جو گھر کی تکمیل میں کام آتے ہیں، اگر ان میں سے کچھ موجود نہ ہوں تو گھر کی عمارت موجود رہے گی لیکن اس میں نقائص ہونگے؛ وہ مکمل اور بے عیب نہیں ہوگا لیکن اگر سارے ہی ستون موجود نہ ہوں تو گھر اپنی جگہ قائم نہیں رہ سکتا بلکہ اس کا وجود ہی بعید از قیاس ہے۔ خاص طور پر اگر سب سے اہم ستون موجود نہیں[1] تو گھر کھڑا نہیں رہ سکتا یا کہا ہی نہیں جاسکتا کہ یہ کوئی گھر ہے۔ اس پہلو پر تمام اہلِ علم اتّفاق رکھتے ہیں۔[2]

حدیث سے کچھ ابہام یوں پیدا ہو سکتا ہے کہ چار ستونوں کا دارومدار پہلے ستون یعنی شہادت پر ہے، جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا۔ یقیناً تمام اعمال بیکار ہوں گے اگر اس پہلے ستون کی موجودگی کی شرط ہی پوری نہ ہو۔ لیکن پھر سوال اٹھتا ہے کہ ایک بنیاد بذاتِ خود دوسری بنیادوں کیلئے بنیاد کیسے ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک چیز سے دوسری چیز بنائی جاسکتی ہے بالآخر یہ ایک مربوط عمارت کی شکل بن جائیگی جس کے ایک سے زیادہ ستون ہونگے۔ اصحابِ علم اس میں ایک ایسے خیمے کی مثال دیتے ہیں جو چمڑے یا بالوں کا بنا ہوا ہو اور

---

[1] مرکزی ستون کلمۂ شہادت ہے۔

[2] ابنِ رجب، جامی، جلد 1، ص۔145۔ اس صورت میں کیا ہوگا جبکہ بقیہ ستونوں میں سے کوئی موجود نہ ہو؟ اس سوال کا جواب نیچے ہر ایک ستون کے حوالے سے دیا گیا ہے۔

Marfat.com

17 حدیث نمبر3: "اسلام پانچ [ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے"

ایک ایسا گھر جو پانچ ستونوں پر کھڑا ہو، پہلا سب سے اہم ستون درمیان میں ہو اور مزید چار ستون اس کے اطراف ہوں جو اسے سہارا بھی دیتے ہوں۔ لیکن جب تک درمیان والا ستون موجود ہے اور اپنی جگہ پر کھڑا ہوا ہے تو یہ کہا جائیگا کہ گھر موجود ہے اور اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اور اگر درمیان کا ستون ہی گر جاتا ہے تو اسکے باوجود کہ باقی ستون موجود ہیں، یہ کہا جائیگا کہ گھر قائم نہیں رہا۔ لہٰذا، مجموعی طور پر پانچوں کو بنیادیں ہی کہا جائیگا۔ لیکن انفرادی طور پر دوسری بنیادیں اس پہلی اور اہم ترین بنیاد کے استحکام اور اسکی صحت پر ہی منحصر ہونگی۔[1]

درحقیقت پہلا ستون باقی دوسرے ستونوں کیلئے اہم بنیاد کا کام کرتا ہے جو اسکے عملی مظاہر ہیں۔ یہ پہلا ستون باقی ستونوں کی تکمیل کیلئے راستہ اور سمت فراہم کرتا ہے۔ یہ پہلا ستون کسی فرد کیلئے جتنا مستحکم ہوگا اُسکے لیے دوسرے ستون اتنے ہی مضبوط ہونگے۔ یہ ضروری ہے کہ یہ ایک دوسرے کے ساتھ ایک اِکائی کی صورت میں کام کریں۔ ایک بار حَسَن بصری ایک قریبُ المرگ شخص سے ملاقات کیلئے گئے تو اس سے پوچھا "تم نے اس موقعے کیلئے کیا تیاری کی ہے؟" اس نے جواب دیا "میں کئی سالوں سے کلمۂ شہادت کہہ رہا ہوں" الحَسَن نے کہا "یہ تو خیمے کی میخ ہوئی اس کی رسّیاں کہاں ہیں؟"[2]، یعنی یہ ضروری ہے کہ اس کلیدی میخ کو اضافی مدد فراہم کرنے کیلئے اسلام کے دوسرے اعمال موجود ہوں اگر وہ موجود نہیں ہوں گے تو عمارت کا باقی حصہ قائم نہیں رہ سکے گا۔

---

[1] جیسا کہ، ابنِ حجر فتح (دارالفکر)، جلد1، ص ص۔73-72؛ شنقیطی، جلد1، ص۔415۔

[2] حوالہ در القاری، جلد1، ص۔66۔

Marfat.com

''شہادت دینا کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے''

ایمان کی یہ شہادت انکار اور اقرار کا ایک امتزاج ہے۔ انکار پہلے آتا ہے اور اقرار بعد میں، یہ عربی زبان میں مکمل جامعیت کے شدید ترین اظہار کا طریقہ ہے۔ لہٰذا شہادت دینے کے معنی ہیں: بلا استثنا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں اور کوئی خدا نہیں سوائے اللہ اور صرف اللہ کے۔

بنیادی طور پر یہ شہادت اسلام میں موجود توحید کے تصوّر کے مطابق ایمان کا اظہار ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے آنے والی حدیث میں ''اللہ پر ایمان'' کے عنوان کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔

لا الٰہ الا اللہ کی شرائط[1]

مسلمان جانتے ہیں کہ جنّت کی کنجی ''لا الٰہ الا اللہ'' ہی ہے۔ بہت سے مسلمان صرف اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ یہ شہادت دی جائے اور اس پر ایمان رکھا جائے، تو وہ ہر نقصان سے محفوظ ہو گئے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف یہ زبانی کلامی شہادت ان کو جنّت میں پہنچا دے گی۔ لیکن صرف زبان سے جملے کا ادا کر دینا نجات کیلئے کافی نہیں۔ یہ تو منافقین بھی کہا کرتے

---

[1] کلمۂ شہادت کی شرائط عمومی طور پر جانی پہچانی ہیں اور ان پر متعدد تصانیف میں تفصیل سے بحث کی گئی ہے۔ اوپر پیش کی گئی معلومات میں سے زیادہ تر حکیمی، معارج، جلد 1، ص ص۔315-307؛ عبد اللہ ابن جبرین، الشہادتین (پبلشر اور مقام طباعت کے بارے میں کوئی معلومات نہیں دی گئیں، 1999)، ص ص۔86-77 سے لی گئی ہیں۔ مصنف نے بھی اپنی تصانیف: The Friday Prayer: Part II: Khutbahs (I) (Arora,CO: IANA,1994), pp.4-19; The Friday Prayer: part II Khutbahs (III) (An Arbor, MI: IANA, 1995), pp.35-42۔ میں اس مواد میں سے بہت کچھ پیش کیا ہے۔

Marfat.com

تھے۔ "میں شہادت دیتا ہوں کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے۔۔۔" پھر بھی اللہ نے ان کے متعلق کہا کہ وہ جھوٹے ہیں اور وہ جہنّم کی نچلی ترین وادی میں رہیں گے۔

کلمۂ شہادت جنّت کی کنجی ضرور ہے لیکن بہر حال اس کے ساتھ کچھ شرائط ہیں جن کا پورا ہونا لازمی ہے۔ حَسَن بصری نے ایک بار کسی شخص سے کہا، "تم نے اپنی موت کے لیے کیا تیاری کی؟" اس نے جواب دیا، "کلمۂ شہادت یعنی کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے،" حَسَن نے اس سے کہا، "اس کے ساتھ کچھ شرائط بھی ہیں۔ اور اس بات سے خبر دار رہو کہ کہیں نیک سیرت عورتوں کو بدنام نہ کرو۔"[1] وہب ابنِ مُنبّیح سے جو ایک مشہور تابعی ہیں ایک بار پوچھا گیا، "کیا کلمہ لا الٰہ الا اللہ، جنّت کی کنجی نہیں ہے؟" ان کا جواب تھا، "ہاں، ہر چابی کے کچھ دندان ہوتے ہیں اگر تم ایسی چابی کے ساتھ آؤ جس کے تمام دندان درست ہیں تو تمہارے لیے دروازہ کھل جائے گا لیکن اگر تمہارے پاس درست دندان موجود نہیں تو تمہارے لیے دروازہ نہیں کھلے گا۔"

یہ دندان دراصل وہ شرائط ہیں جو ممتاز کرتے ہیں ایسے مسلمانوں کو جن کیلئے کلمۂ شہادت مفید ہو گا ایسے مسلمانوں سے جنہیں اس کلمے سے فائدہ نہیں ہو گا، اس سے قطع نظر کہ وہ اس کلمے کو روزانہ کئی بار ہی کیوں نہ دُہراتے ہوں۔

کلمۂ شہادت کے ساتھ مربوط شرائط پر بحث کرنے سے قبل ایک اور نکتے کو واضح کرنا ضروری ہے۔ کچھ لوگوں میں یہ رُجحان پایا جاتا ہے کہ وہ ایک حدیث یا ایک آیت کو لے کر اور صرف اس کے متن کو بنیاد بنا کر کچھ عمومی نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی ایک حدیث سے یہ نتیجہ نکال لے کہ اگر صرف یہ کہے کہ "کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے" تو وہ جنّت کا حقدار ہو جائے گا۔ لیکن ہمیں اس بات کو سمجھنا چاہیے کہ

---

1 حسن جس شخص سے گفتگو کر رہے تھے وہ ایک شاعر تھا جو نیک سیرت عورتوں کو {اپنی شاعری کے ذریعے} بدنام کیا کرتا تھا اور اس وجہ سے حسن نے اس پر اس نکتے کو واضح کیا۔ دیکھیں بادی، جلد 1، ص ص۔ 162-164۔

Marfat.com

ساری آیاتِ قرآنی اور احادیث ایک دوسرے کی معاون ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتی ہیں، کسی بھی معاملے کے درست حل تک پہنچنے کے لیے، اس معاملے کے متعلّق تمام آیاتِ قرآنی اور احادیث سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور اسی طرزِ فکر سے درست اسلامی نقطۂ نظر تک پہنچا جاسکتا ہے۔ کلمۂ شہادت کی شرائط کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا جائیگا۔

آیاتِ قرآنی اور احادیثِ رسول اللہ ﷺ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کلمۂ شہادت سے وابستہ شرائط سات، آٹھ یا شاید نو ہیں اور یہ تعداد اس پر منحصر ہے کہ کوئی ان شرائط کو کیسے دیکھتا ہے۔ یہ بہت اہم ہے کہ ہر مسلمان اس بات کا خیال رکھے اور اسے یقینی بنائے کہ وہ اپنی زندگی میں کلمۂ شہادت کے حوالے سے یہ شرائط پوری کر رہا ہے۔

ان میں سے پہلی شرط [العلم] جاننا ہے۔ ایک مسلمان کے پاس اس بات کا ضروری اور بنیادی علم موجود ہونا چاہیے کہ شہادت کے کیا معنی ہیں۔ اسے اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ وہ شہادت کے ذریعے کس بات کا اقرار کر رہا ہے اور کس بات کا انکار کر رہا ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔

"پس جان رکھو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اپنے قصور کی معافی مانگو اور مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے بھی۔" (محمد:19)

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے،

من مات وهو يعلم انه لا اله الا الله دخل الجنته۔

"جس کی موت اس حال میں ہوئی کہ وہ جانتا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں وہ جنّت میں داخل کیا جائیگا۔" (مسلم)

درحقیقت شہادت خود ایک اقرار ہے جو کسی بات کا اقرار کرے اسے اس بات کا علم ہونا چاہیے کہ وہ کس بات کا اقرار کر رہا ہے۔ بلاشبہ ایسا اقرار کہ جس کے متعلّق اقرار کرنے

Marfat.com

والا یہ جانتا ہی نہیں کہ کس بات کا اقرار کر رہا ہے قابلِ قبول نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک میں ارشاد ہے،

اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ۔

"اِلّا یہ کہ کوئی علم کی بناء پر حق کی شہادت دے۔" (زخرف:86)

لہٰذا، وہ جو کلمۂ شہادت پڑھ رہا ہے اسے اسکے متعلّق بنیادی علم ہونا ضروری ہے۔[1] مثال کے طور پر اگر وہ فہم ہی نہیں رکھتا کہ صرف اللہ ہی ہے جو عبادت کے لائق ہے اور اسکے سوا تمام خدا جھوٹے ہیں تو ایسی صورت میں اس کے پاس اس شہادت سے متعلّق جو وہ دے رہا ہے بنیادی علم بھی موجود نہیں۔ اس قسم کی شہادت کے متعلّق یہ تصوّر غلط ہے کہ یہ صحیح شہادت ہے اور اللہ کے ہاں قابلِ قبول ہو گی۔

شہادت کے لیے دوسری شرط یقین ہے، یہ شک یا تذبذب کی ضِد ہے، اسلام میں درحقیقت کسی ایسی بات کے بارے میں شک کرنا جس کی تصدیق قرآن یا سُنّت سے ہوتی ہو کفر یا ایمان کا نہ ہونا ثابت کرتا ہے۔[2] ایک شخص کیلئے لازم ہے کہ وہ دل سے اس شہادت کے حق ہونے کا یقین رکھے۔ اسے دل میں اس حقیقت کو ماننے میں کوئی تذبذب نہیں ہونا چاہیے کہ "کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے" اللہ تعالیٰ ایسے مومنین کے متعلّق فرماتے ہیں کہ وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں پھر اسمیں شک نہیں کیا۔

---

[1] اگر ایک شخص اللہ کے بارے میں تفصیلی علم نہیں رکھتا لیکن بنیادی اہم امور کا پابند رہتا ہے، تو اس سے اس کے مسلمان ہونے کو رد نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم، یہ لازمی ہے کہ اس کے بعد وہ کسی تفصیلی امر کا انکار نہ کرے جبکہ اس کی رسائی تفصیلی علم تک ہو جائے۔ جیسا کہ ڈبلیو العمری، ص۔49۔

[2] اس سے ایک استثنا لاعلمی کی صورت میں ہے جبکہ کوئی کسی معاملے میں، شک میں مبتلا ہے اور اُسے یہ علم نہیں کہ اس کا ثبوت قرآن اور سنت میں موجود ہے۔ لیکن جب بھی اس شخص کو معلوم ہو جائے کہ ایک بات کا واضح طور پر قرآن اور سنت میں ثبوت موجود ہے، اس کے پاس اس میں کوئی شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

Marfat.com

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔

"حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لائے پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ وہی سچے لوگ ہیں۔" (حجرات:15)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

اشهد ان لا اله الا اللّٰه وانی رسول اللّٰه لایلقی اللّٰه بهما عبد غیرشاک فیهما الا دخل الجنة۔

"کوئی ایسا نہیں جو اللہ سے اس حالت میں ملے کہ اس نے اقرار کیا ہو کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے اور میں اللہ کا رسول ہوں اور اس میں کوئی شک نہیں، سوائے اسکے کہ وہ جنّت میں داخل ہو گا۔" (بخاری و مسلم)

دوسری جانب منافقین ہیں جن کے دل متذبذب رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں فرماتے ہیں،

اِنَّمَا یَسْتَاْذِنُكَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ ارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِیْ رَیْبِهِمْ یَتَرَدَّدُوْنَ۔

"ایسی درخواستیں تو صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ اور روزِ آخر پر ایمان نہیں رکھتے، جن کے دلوں میں شک ہے اور وہ اپنے شک ہی میں مُتردّد ہو رہے ہیں۔" (التوبہ:45)

بہت سے اہلِ علم یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ دل کی بیماریاں یا شکوک وشبہات کو اگر کوئی شخص اپنے دل میں جگہ دے تو وہ شہوات اور خواہشاتِ نفس سے زیادہ خطرناک ہوتی ہیں۔ یہ اس لیے کہ شہوات اور خواہشات اگر ممکنہ طور پر پوری بھی ہو جائیں تو ایک انسان کو ان کے غلط ہونے کا شعور ہوتا ہے۔ لہٰذا، بالآخر وہ اپنے آپ پر قابو پا سکتا ہے، توبہ کر سکتا ہے اور ان بُرے کاموں سے کنارہ کشی اختیار کر سکتا ہے۔ دوسری جانب شکوک وشبہات دل

Marfat.com

میں بسے رہتے ہیں؛ اور ان کا کوئی علاج نہیں۔ ایسی صورت میں یا تو ایک شخص دائرۂ اسلام سے بالکل باہر نکل جاتا ہے یا اسلام پر عمل تو کرتا ہے، لیکن در حقیقت اسکے دل میں سچا ایمان موجود نہیں ہوتا۔

ان شکوک کا ایک بہت اچھا علاج علم ہے۔ قرآن و سُنّت کی صحیح تعلیم ان شکوک کو اگر مکمل طور پر نہیں تو ان کی اکثریت کو دور کر دیتی ہے۔ تعلیم اور تفہیم کے ذریعے ایک شخص یقین حاصل کر سکتا ہے: جیسے جیسے پڑھنے اور جاننے کا عمل آگے بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کے یقین کی پختگی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

شہادت کی تیسری شرط مان لینا یا (القبول) ہے۔ اگر ایک شخص شہادت پر علم اور یقین رکھتا ہے تو پھر اگلا قدم اسکے اقرار کا ہے کہ وہ زبان اور دل سے ان تمام باتوں کو مانے جن کا کلمۂ شہادت تقاضا کرتا ہے۔ جو کوئی شہادت اور اسکے تقاضوں کا اقرار کرنے سے انکار کرتا ہے اس کے باوجود کہ اُسے علم ہے اور وہ اسکی حقّانیت پر یقین رکھتا ہے وہ غیر مومن ہی ہوگا، ایسا انکار اکثر تکبّر کا نتیجہ ہوتا ہے یا اس کی وجہ حَسَد وغیرہ ہوتی ہے۔ {اس بات کو نوٹ کیجئے کہ لوگ اکثر بہت سی مفید باتوں کو صرف اس بنا پر قبول نہیں کرتے کہ ان کے خیال میں انہیں ماننے سے اس شخص کا قد بڑھ جائے گا جس نے ان باتوں کو پیش کیا تجویز کیا یا انکی نصیحت کی ہو اور اسطرح انکے خیال میں انکی تحقیر ہو جائے گی (مترجم)}۔ بہر حال جو وجہ بھی ہو ایسی شہادت سچّی نہیں جس میں بلا کسی شرط کے مان لینا شامل نہیں۔

اکثر اہلِ علم شہادت کی اس تیسری شرط کے بارے میں عمومی طور پر بحث کرتے ہیں جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے۔ مگر اسکے کچھ تفصیلی پہلو ہیں جن کا احاطہ ضروری ہے۔ اس شرط میں یہ بھی شامل ہے کہ ایک شخص قرآن کی اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو بِلا چوں چرا تسلیم کرے نہ کہ اپنی خواہش کے مطابق جسے چاہے مانے اور جسے چاہے نہ مانے، قرآن میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

Marfat.com

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ۔

"تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، اُن کی سزا اِس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل و خوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟" (البقرہ:85)

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے،

وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ۬ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔

"کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ﷺ کسی معاملے کا فیصلہ کر دیں تو پھر اُسے اپنے معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے۔ اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے تو وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔" (الاحزاب:36)

شہادت کی چوتھی شرط جھک جانا اور اسے پورا کرنا یا [الانقیاد] ہے۔ اس کے معنی اپنے عمل سے شہادت کا ثبوت دینا ہے، یہی لفظِ اسلام کے معنی بھی ہیں "اللہ کی رضا اور اسکے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا" اللہ تعالیٰ قرآن میں حکم فرماتے ہیں،

وَ اَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا لَهٗ۔

"پلٹ آؤ اپنے ربّ کی طرف اور مطیع بن جاؤ۔" (الزمر:54)

اللہ نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے جو اپنے افعال سے اللہ کے احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

Marfat.com

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ۔

"اُس شخص سے بہتر اور کس کا طریقِ زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور اپنا رویّہ نیک رکھا" (النساء:125)

اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے رسول ﷺ کے حکم کے آگے جھک جانے کو ایمان کی شرط بنادیا اور فرمایا،

فَلَا وَ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَ يُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا۔

"نہیں، اے محمد ﷺ ! تمہارے ربّ کی قسم یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا (منصف) نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی نہ محسوس کریں، بلکہ (رسول کے فیصلے کو) سر بسر تسلیم کر لیں۔" (النساء:65)

جیسا کہ ایمان کے عنوان کے تحت یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ شہادت ایسے اقرار کو کہتے ہیں جس کا نفاذ، دل پر، زبان پر اور افعال کی صورت میں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک شخص کے دل میں اللہ کی محبّت، خشیّت اور امید موجود ہو۔ اپنی زبان سے لازماً شہادت کا اقرار کرے اور اپنے افعال میں وہ کچھ نافذ کرے کلمۂ شہادت جن کا تقاضا کرتا ہے۔ ایسا شخص جو کہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے لیکن کوئی ایسا عمل نہیں کرتا جو اس دعوے کے مطابق ہو ایسی صورت میں یا تو اس نے اسلام کو سمجھا ہی نہیں یا پھر یوں کہیے کہ وہ اپنے کلمۂ شہادت کے خلاف خود یہ شہادت دے رہا ہے کہ وہ سچّی اور درست شہادت نہیں تھی۔

اس کے معنی یہ نہیں کہ سچّے مومن گناہ سے مبرّا ہیں۔ درحقیقت سچّے مومنوں سے بھی گناہ سرزد ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب تک ان میں یہ احساس ہے کہ ان سے غلط کام سرزد ہوا جو اللہ کے حکم ماننے کے فرض سے کوتاہی تھی تو انہوں نے اپنے کلمۂ شہادت کی سند کو قائم رکھا ہوا ہے اور اس کی حدود سے تجاوز نہیں کیا۔

Marfat.com

پانچویں شرط [الصدق]یا سچّائی ہے جو کہ دھوکے بازی اور منافقت کی ضِد ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ جب کوئی شہادت دے رہا ہے وہ سچّائی کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہے اور وہ کلمۂ شہادت کہتے وقت جھوٹ نہیں بول رہا یا پھر اس کے برعکس صورت وہ ہے جبکہ وہ کسی کو دھوکا دینے یا بے وقوف بنانے کے لیے ایسا کہہ رہا ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے،

مامن احد یشھد ان لا الہٰ الا اللّٰہ وان محمداً رسول اللّٰہ صدقاً من قلبہ الا حرمہ اللّٰہ علی النار۔

"کوئی شخص سچّائی کے ساتھ اپنے دل سے شہادت نہیں دیتا کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے اور محمد اللہ کے رسول ہیں بجز اسکے کہ اللہ اس پر نارِ جہنّم حرام کر دیتا ہے۔" (البخاری)

زیادہ تر لوگوں نے ایسے افراد دیکھے ہوں گے جو شہادتِ ایمان دیتے ہیں لیکن وہ ایسا سچّائی کے ساتھ نہیں کرتے، وہ اس پر ایمان نہیں رکھتے۔ وہ ایسا محض اپنے تحفّظ کیلئے یا کوئی دنیاوی فائدہ حاصل کرنے کی غرض سے کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ منافقین ہیں۔ اللہ نے قرآن کی ابتدائی آیات میں ہی ان کا ذکر کر دیا،

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ۔ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ۔ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ۔

"بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائے ہیں ، حالانکہ در حقیقت وہ مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ اور ایمان لانے والوں کے ساتھ دھوکا بازی کر رہے ہیں، مگر دراصل وہ خود اپنے آپ ہی کو دھوکے میں ڈال رہے ہیں اور اُنہیں اس کا شعور نہیں ہے۔ ان کے دلوں میں ایک بیماری ہے جسے اللہ نے اور زیادہ بڑھا دیا، اور جو جھوٹ وہ بولتے ہیں، اُس کی پاداش میں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔" (البقرہ:10-8)

Marfat.com

ایسے لوگ جن کے مسلمان ہونے کا مقصد دنیاوی مفاد کا حصول تھا اور اسلام لانا ان کے پیشِ نظر نہ تھا، تو ان کی شہادت روزِ قیامت مسترد کر دی جائیگی اور اپنے جھوٹ کے سبب وہ دردناک عذاب میں مبتلا کیے جائینگے۔

چھٹی شرط [الاخلاص] خلوصِ نیّت ہے۔یعنی جب کوئی شہادت دیتا ہے تو ایسا اسے خالص اللہ تعالیٰ ہی کیلئے کرنا چاہیے۔ اور اسے کسی اور وجہ سے یا کسی اور کیلئے نہیں کرنا چاہیے۔ اس اعتبار سے اخلاص کے معنی شرک یا اللہ کے ساتھ کسی اور کو ملانے کی ضِد ہیں۔ ایک شخص مسلمان ہوتا ہے اور مسلمان رہتا ہے صرف اللہ کی بندگی کی غرض سے اس لیے کہ اللہ کے غصے اور سزا سے بچے اور یہ کہ اسکی رحمت اور انعامات کے حصول کی خواہش رکھے، اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں،

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ۔

"تم اللہ ہی کی بندگی کرو دِین کو اُسی کے لیے خالص کرتے ہوئے۔" (الزمر:2)؛ اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں،

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ۔

"اور ان کو اس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں، اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے بالکل یکسو ہو کر، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، یہی نہایت صحیح اور درست دین ہے۔"(البینۃ:5)

ان اللّٰہ قد حرم علی النار من قال لا الہٰ الا اللّٰہ یبتغی بذالک وجہ اللّٰہ۔

"اللہ نے جہنّم کی آگ حرام کر دی ان لوگوں پر جنہوں نے کہا' کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے' اور وہ ایسا محض اللہ کی خوشنودی اور رضا کیلئے کہتے ہیں"۔(مسلم)

Marfat.com

یہ ایسی بات ہے جس کے بارے میں ہر مسلمان کو سوچنا چاہیے، خاص طور پر وہ افراد جو مسلم خاندانوں میں پرورش پاتے ہیں اور پیدائشی طور پر مسلمان ہیں۔ ہر ایک کو اپنے تئیں یہ بات طے کرنی چاہیے کہ وہ اللہ کی خاطر مسلمان ہے یا نہیں۔ ایک مسلمان اپنے ماں باپ کیلئے مسلمان نہیں ہو سکتا نہ ہی اپنے دوستوں، خاندان والوں، برادری یا کسی دنیاوی مقصد سے مسلمان ہو سکتا ہے۔ یہ بات ذہن میں روزِ روشن کی طرح عیاں ہونی چاہیے کہ ایک شخص شروع سے آخر تک صرف اللہ کیلئے ہی مسلمان ہے۔

ساتویں شرط محبّت ہے، یعنی ایک مومن اپنی شہادت سے محبّت رکھتا ہے، وہ اس کے مضمرات اور اسکے تقاضوں سے محبّت رکھتا ہے۔ اور وہ ان لوگوں سے بھی محبّت رکھتا ہے جو اس شہادت کے مطابق عمل کرتے ہیں اور جدوجہد کرتے ہیں۔ یہ شہادت کی لازمی شرط ہے۔ اگر ایک شخص شہادت دیتا ہے لیکن اسکے دل میں اس شہادت کی اور اُسکی محبّت نہیں جس کے لیے یہ شہادت قائم کی گئی تو ایسی صورت میں اسکی شہادت نامکمل ہے — یہ ایک سچّے مومن سے مناسبت نہیں رکھتی — اگر اس میں شہادت سے کوئی محبّت نہیں حتی کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے تو دراصل اس نے اپنی شہادت کی خود ہی نفی کر دی۔

سچّا مومن کسی کو بھی اپنی محبّت میں اللہ کے برابر درجہ نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں ارشاد فرماتے ہیں،

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ۔

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِّ مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسے اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے۔ حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔" (البقرہ:165)۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

Marfat.com

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔

"اے نبی ﷺ، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں، اور تمہارے عزیز و اقارب، اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار، جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے، اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔"(التوبہ:24)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے،

ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللّٰہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما۔

"جس میں تین صفات ہونگی وہ ایمان کی مٹھاس کو پالے گا(ان میں سے پہلی) یہ کہ وہ اللہ اور اُسکے رسول کو محبوب رکھتا ہو ہر شے سے زیادہ۔۔۔۔"(البخاری و مسلم)

شہادت کی آٹھویں شرط یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا ہر معبود کا انکار کر دے۔ حالانکہ یہ تو کلمۂ شہادت ایمان کے اندر ہی موجود ہے، لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہر شہادت دینے والے کے سامنے یہ امر واضح نہیں، لہٰذا، اس کا تذکرہ علیحدہ سے کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔

سورۃ البقرہ میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو شہادت کے اس اہم پہلو کی یاد دہانی کراتے ہیں کہ شہادت نری تصدیق کا نام نہیں بلکہ یہ تصدیق بھی ہے اور جھٹلانا یا تکفیر بھی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

Marfat.com

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا۔

"اب جو کوئی طاغوت کا اِنکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اُس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔" (البقرہ:256)

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس نکتے پر زور دیا اور فرمایا،

من قال لا الٰہ الا اللّٰہ وکفر بمایعبد من دون اللّٰہ حرم ما لہ ودمہ وحسابہ علی اللّٰہ۔

"جس نے کہا کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے اور ان سب [معبودوں] کا انکار کر دیا جو اللہ کے سوا پوجے جاتے ہیں پھر اُسکا مال اور اُسکا خون امان میں ہیں اور اُسکا حساب اللہ پر ہے" (مسلم)

گو کہ اس شرط کا علم ہر اس شخص کو ہونا چاہیے جو اپنی زبان سے کلمۂ شہادت کے الفاظ ادا کرتا ہے، اسکے باوجود ہم ایسے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں جو کہ اللہ کے سوا دوسری ہستیوں اور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ لوگ قبرستانوں میں جا کر اہلِ قبور کی پرستش کرتے ہیں۔ وہ عبادت کے افعال اللہ کے لیے نہیں بلکہ مرے ہوئے قبروں میں مدفون اولیا کے لیے ادا کرتے ہیں۔

نویں شرط شہادت کی یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنی وفات تک اس پر قائم رہے: اگر شہادت کا اثر یوم آخر میں دیکھنا مقصود ہے تو یہ بات ضروری ہے کہ ایک شخص صرف اسی کے بل بوتے پر مطمئن نہ رہے کہ جو کچھ اس نے ماضی میں کیا؛ نہیں، بلکہ وفات تک شہادت کو اس کا اُوڑھنا بچھونا ہونا چاہیے، قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔" (آلِ عمران:102)

Marfat.com

محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ کے رسول ہیں[1]

یہ بات عام فہم ہے کہ اسلام میں داخلے کیلئے اس بات کا اقرار لازمی ہے کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے اور یہ کہ محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ کے رسول ہیں۔ کئی بار شہادت کا پہلا حصہ تفصیل سے زیرِ بحث آتا ہے حالانکہ شہادت کے دوسرے حصے کے معنی اور اسکے مضمرات کو سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات لوگ کلمۂ شہادت کے اس دوسرے حصے پر درست طریقے سے عمل نہ کرنے کے سبب سیدھی راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔

جب کوئی یہ گواہی دیتا ہے کہ محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم اللہ کے رسول ہیں، تو وہ یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اللہ نے محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اپنے رسول کی حیثیت سے منتخب کیا تاکہ وہ اسکا پیغام لوگوں تک پہنچائیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا،

وَ رَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ۔

"تیرا ربّ پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور (وہ خود ہی اپنے کام کے لیے جسے چاہتا ہے) منتخب کرلیتا ہے۔" (القصص:68)

اللہ تخلیق کرتا ہے اور یہ طاقت رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے اللہ تعالیٰ نے بالخصوص رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اپنے رسول کی حیثیت سے منتخب کیا۔

{یہ بات واضح ہے کہ اللہ کے سب کام حکمت سے بھرپور ہوتے ہیں اور اسکا انتخاب یوں ہی بے وجہ نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا خاتم النّبیین کی حیثیت سے مامور کیا جانا، انکا جزیرہ نمائے عرب میں مبعوث ہونا، اس آخری پیغام کو انسانیت تک پہنچانے کے لیے وقت کا

---

[1] اس حصے کی تیاری میں مصنف نے ایک بار پھر ابنِ جبرین، الشہادتین، ص ص۔76-29 پر موجود معلومات سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے۔

Marfat.com

انتخاب، اس پیغام کیلئے عربی زبان کا انتخاب؛ یہ سب کچھ قدرت کے ایک بے عیب منصوبے کے تحت ہیں جس پر جوں جوں غور کریں اس میں موجود حکمتیں ظاہر ہوتی جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے وجود، اسکی حکمت اور اسکی قدرت پر یقین پختہ تر ہوتا جاتا ہے۔(مترجم)}

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

اَللّٰہُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ۔

" اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کا کام کس سے لے اور کس طرح لے۔"(الانعام:124)

اس سے رسول اللہ ﷺ کے کردار وصفات کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یقیناً اپنے پیغام کے ارسال کے لیے کسی ایسے شخص کو منتخب نہیں کر سکتا جو دھوکے باز یا جھوٹا ہو۔ اللہ کسی ایسے شخص کو بھی اس اہم ذمہ داری کیلئے منتخب نہیں کر سکتا جس کے متعلّق وہ جانتا ہے کہ وہ اسکے پیغام کو نہیں پہنچائے گا بلکہ وہ اس رتبے کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرے گا۔ اگر کوئی یہ خیال بھی کرتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا پیغام مکمل طور پر نہیں پہنچایا یا یہ کہ اس میں ردّوبدل کر دیا تو ایسا سوچنا اس بات کا مظہر ہے کہ اسکے خیال میں اللہ تعالیٰ کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اسکی پیغام رسانی کیلئے کون موزوں ہے، یہ یقیناً کفر ہے۔

{عصمت الانبیا کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ جن افراد کو منصبِ رسالت کے لیے منتخب کرتا ہے ان کی حفاظت کا بھی بہترین انتظام کرتا ہے، اسطرح ان کے کردار بے داغ ہوتے ہیں وہ معاشرے میں پاکیزہ صفت اور معتبر افراد کی حیثیت سے اٹھائے جاتے ہیں۔ چند دوسرے مذاہب کے پیروکاروں نے جن میں اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ پیش پیش ہیں اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتابوں میں تحریف کی اور انبیا سے غلط سلط داستانیں منسوب کر کے ان کی شخصیات کو اس قدر بد نما بنا کر پیش کیا ہے کہ ایسی شخصیات کو رہبر و رہنما ماننا تو درکنار ان کے لائے ہوئے پورے پیغام کو بھی مشکوک بنا دیا ہے۔(مترجم)}

Marfat.com

دوسرا یہ کہ کوئی شہادت دے کہ رسول اللہ ﷺ تا قیامت تمام انسانیت کیلئے بھیجے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ارشاد ہے،

قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔

"اے نبی ﷺ ! کہو کہ 'اے انسانو! میں تم سب کی طرف خدا کا پیغمبر ہوں۔'"

(الاعراف:158)۔ رسول اللہ ﷺ نے مزید فرمایا،

اعطیت خمساًلم یعطھن احدً من الانبیاءقبلی....وکان النبی یبعث الی قومہ خاصۃ وبعثت الی الناس کافۃ۔

"مجھے پانچ ایسے اوصاف دیئے گئے ہیں جو مجھ سے قبل کسی نبی کو نہیں دیئے گئے.... [ان میں سے ایک یہ ہے] کہ ہر نبی صرف اپنی قوم ہی کی طرف بھیجا گیا جبکہ مجھے ساری انسانیت کی طرف بھیجا گیا۔" (البخاری و مسلم)

{اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد سے لے کر آج کے دور اور قیامت تک کے وقت کیلئے آپ ﷺ کا لایا ہوا دین ہی قابلِ عمل ہے اور یہ دین تمام انسانیت کیلئے ہے جس میں اہلِ کتاب بھی شامل ہیں حتّٰی کہ مسیح علیہ السلام جب دوبارہ اس دنیا میں وارد ہونگے تو وہ رسول اللہ ﷺ کے امتّی کی حیثیت سے ہی تشریف لائیں گے (مترجم)}

رسول اللہ ﷺ کے وقت سے لے کر قیامت تک آنے والے تمام انسانوں پر یہ لازم ہے کہ وہ ان پر ایمان لائیں اور انکی پیروی کریں۔ اگر اسلام کا پیغام کسی شخص تک صاف طور پر پہنچ جائے اور اسکے باوجود وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لائے اور نہ ہی اُن کی پیروی کرے تو ایسا شخص کافر ہے اور وہ ہمیشہ کیلئے جہنّم کی آگ میں رہے گا اِلّا یہ کہ وہ توبہ کرلے اور اسلام قبول کرلے۔

بہر حال اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات قیامت تک کے لیے ہیں اور تمام انسانیت پر ان کو تسلیم کرنا فرض ہے۔ یعنی آپ ﷺ کی تعلیمات صرف ان

Marfat.com

کے دور میں بسنے والی عرب نسل کیلئے ہی نہیں، بلکہ یہ تعلیمات آج کے دور میں بسنے والے ہر مسلمان کے لیے بھی اسی طرح نافذ العمل ہوں گی، چاہے وہ شخص نیویارک میں رہتا ہو یا ملائیشیا میں۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اس خیال کے حامل ہیں کہ ان کیلئے رسول اللہ ﷺ کی اتّباع ضروری نہیں۔ اگر وہ ایسا سمجھتے ہیں تو انہیں جان لینا چاہیے کہ یہ رویّہ انکی اپنی ہی دی ہوئی شہادت کی نفی ہے۔ وہ شہادت دے چکے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا پیغام جس میں قرآن اور القا کی گئی آپ ﷺ کی سُنّت شامل ہیں، تمام انسانیت کیلئے ہیں جس میں آج کے دور میں موجود ہر ایک شامل ہے۔

تیسرے یہ کہ جب ایک انسان شہادت دیتا ہے تو وہ یہ اقرار کرتا ہے کہ اُسکا اس بات پر پکا ایمان ہے کہ آپ ﷺ نے پیغام پہنچادیا۔ آپ ﷺ نے ٹھیک ٹھیک یہ پیغام پہنچایا، اسے پورا کا پورا پہنچایا اور اسے واضح طور پر پہنچایا، اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں فرماتے ہیں،

وَمَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔

"'رسول ﷺ کی ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ صاف صاف حکم پہنچا دے۔'" (النور:54)

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے،

قدترکتکم علی البیضاء لیلها کنهارها لا یزیغ عنها بعدی الا هالک۔

"میں نے تمہیں ایک روشن رستے پر ڈال دیا ہے جس کے رات اور دن یکساں ہیں، کوئی اس راستے سے میرے بعد نہیں بھٹکے گا سوائے اسکے جسے تباہی نے آلیا۔"[1]

رسول اللہ ﷺ نے وہ تمام ہدایت اور وحی جو اللہ سے انہیں موصول ہوئیں ہم تک پہنچادیں۔ نہ صرف پہنچایا بلکہ اسے ایک صاف اور واضح انداز میں پیش کر دیا۔ لہٰذا، شہادت

---

[1] اسے احمد اور البیہقی نے محفوظ کیا، الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ دیکھیں الالبانی، صحیح الجامی الصغیر، جلد2، ص۔805، حدیث نمبر 4369۔

Marfat.com

دینے والا، یہ بھی اقرار کر رہا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے دین کے تمام اُمور جن میں بنیادی اور فروعی امور شامل ہیں، پہنچادیئے۔ دین کا کوئی ایسا حصہ نہیں جسکی انسانیت کو ہدایت کی غرض سے ضرورت ہو سکتی ہے اور جسے آپ ﷺ نے انسانیت تک نہ پہنچایا ہو۔ نہ ہی یہ ممکن ہے کہ اللہ یا اُسکا رسول ﷺ کچھ بھول گئے ہوں۔

لہٰذا، جب رسول اللہ ﷺ سے آئی ہوئی صاف اور مکمل ہدایت موجود ہے تو اس مقصد کیلئے کسی اور سے رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسے کہ اس کی ضرورت نہیں کہ کوئی یہود ونصاریٰ کی کتابوں میں اسے تلاش کرے۔ یہاں تک کہ ایک بار آپ ﷺ نے عمرؓ کو تورات پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ اگر میرے زمانے میں موسیٰ علیہ السلام بھی موجود ہوتے تو وہ میرے ہی راستے کی پیروی کرتے۔[1] مزید یہ کہ، مثال کے طور پر، ایک مسلمان کو اس بات کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا رخ یونانی فلسفے کی طرف کرے، اس مقصد سے کہ الاہیات(theology) کا علم حاصل کرے۔ درحقیقت، ایک مسلمان کو کوئی ضرورت نہیں کہ کسی بھی غیر مسلم کی مذہبی اور روحانی تعلیمات کی طرف ہدایت کی غرض سے رُخ کرے۔ ساری معلومات جن کی ہمیں ضرورت ہے قرآن اور سُنّت میں موجود ہیں۔ ایسا یقین رکھنا اس شہادت کا حصہ ہے جو مسلمان دیتے ہیں۔ مسلمان اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مکمل پیغام پہنچادیا، یہ شہادت کے مفہوم میں شامل ہے۔

جب کوئی یہ اقرار کرتا ہے کہ "محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں" وہ اس بات کا بھی اقرار کر رہا ہے کہ آپ ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ۔

"(لوگو) محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں، مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔" (الاحزاب:40)

---

[1] اسے احمد اور ابنِ ماجہ نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ دیکھیں الالبانی، صحیح الجامی، جلد2، ص۔805۔

Marfat.com

یعنی رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آئیگا، کوئی نیا نبی یا کوئی ایسی کتاب نہیں آئیگی جو کہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات کو تحلیل کر دے۔ مزید یہ کہ اگر کوئی رسول اللہ ﷺ کے بعد یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ کا نبی ہے تو یہ بات واضح ہے کہ ایسا شخص جھوٹا اور دھوکے باز ہے۔[1] ایسے شخص کی مخالفت کرنی چاہیے اور اس بات کا کھلا اعلان کرنا چاہیے کہ نبوّت پر اس کا دعویٰ جھوٹ پر مبنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی شخص کو نبی کی حیثیت سے تسلیم کرنا اپنے اعلانِ شہادت کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔

جب کوئی ایمان کا اقرار کرتا ہے یا شہادت دیتا ہے، اس کے معنی صرف یہ نہیں کہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے بلکہ اس میں یہ شامل ہے کہ وہ کئی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے جو اس شہادت سے نکلتی ہیں۔ جیسے کہ کسی کا یہ اقرار کہ کوئی عبادت کے لائق نہیں سوائے اللہ کے اس بات کا متقاضی ہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہی کی جائے اور اسی صورت میں یہ شہادت درست مانی جائیگی، اسی طرح سے جب کوئی یہ شہادت دیتا ہے کہ "میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں"، وہ اسکے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے متعلّق کچھ ذمہ داریاں قبول کر رہا ہوتا ہے۔ اگر وہ ان ذمہ داریوں کی بجاآوری میں کوتاہی برتتا ہے تو دراصل ایسا کرنا اسکی شہادتِ ایمان میں کمی کا باعث بنتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے انحراف اس قدر بڑھ سکتا ہے کہ شہادت کی مکمل نفی کے مترادف ہو جائے،

رسول اللہ ﷺ سے متعلّق پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ آپ ﷺ سے محبّت کی جائے۔ اس سے مراد محبّت کی عام سطح نہیں، بلکہ مکمل ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آپ ﷺ سے ہر ایک انسان سے زیادہ اور ہر چیز سے بڑھ کر محبّت کی جائے، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا،

---

[1] عیسیٰ علیہ السلام یوم آخرت سے قبل دوبارہ تشریف لائیں گے۔ تاہم، وہ ایک نبی یا رسول کی حیثیت سے تشریف نہیں لائیں گے، بلکہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے اور ان کی شریعت کے پیروکار کی حیثیت سے تشریف لائیں گے۔

Marfat.com

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ اِقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ۔

"اے نبی ﷺ، کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں، اور تمہارے عزیز و اقارب، اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار، جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے، اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔" (التوبہ:24)

رسول اللہ ﷺ سے متعلق دوسری ذمہ داری جو ایمان کے اقرار کے ساتھ عائد ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ شہادت دینے والا اس بات کو تسلیم کر لیتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ زندگی گزارنے اور اسے برتنے کیلئے بہترین مثال ہے جس کی اتباع کرنا اللہ کو خوش کرنے کا صحیح راستہ ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَ الْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَ ذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا۔

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول ﷺ میں ایک بہترین نمونہ تھا، ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔" (الاحزاب:21)۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی فرمان ہے،

Marfat.com

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ۔

"(اے نبی ﷺ!) لوگوں سے کہہ دو کہ 'اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبّت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبّت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔'" (آلِ عمران: 31)

یہ ایک عجیب بات ہے کہ لوگ ایمان کا اقرار کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ رسول ﷺ اللہ کے نبی ہیں۔ پھر بعض معاملات میں وہ آپ ﷺ کو اپنی زندگی میں رہنمائی کے لیے ایک مثالی نمونہ نہیں مانتے جیسا کہ ایک مومن کو کرنا چاہیے۔ صرف یہ ہی نہیں کہ وہ ان کو ایک مثال کے طور پر نہیں لیتے بلکہ وہ ایسے لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کو اپنے لیے ایک مثال سمجھتے ہیں۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ایسے شخص نے ایمان کی اس شہادت کے معنی اور اسکے تقاضوں کو سمجھا ہی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا قول ہے،

اما واللّٰہ انی لا خشاکم للّٰہ واتقاکم لہ لکنی اصوم وافطر اوصلی وارقد واتزوج النساءفمن رغب عن سنتی فلیس منی۔

"میں قسم کھاتا ہوں اللہ کی کہ میں سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں اور تم سب سے زیادہ اس [کی حدود] کو پہچاننے والا ہوں۔ لیکن روزہ رکھتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں اور [رات میں] سوتا بھی ہوں اور میں عورتوں کو ازدواج میں لیتا ہوں۔ جو کوئی میری سُنّت سے منہ موڑے گا وہ مجھ سے نہیں [یعنی میرا سچّا پیروکار نہیں]۔" (البخاری)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے یہ بیان فرمایا کہ آپ ﷺ سب سے زیادہ اللہ کا ڈر اور تقویٰ رکھنے والے ہیں۔ لہٰذا، کسی شخص کے پاس کوئی عذر نہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ اور ان کی ہدایات پر عمل نہ کرے۔ اس سے بڑھ کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو ایسا نہ کرے گا اور ان کی سُنّت سے منہ موڑے گا وہ ان میں سے نہیں۔ کوئی شخص اپنے اس دعوے میں سچّا نہیں ہو گا کہ وہ رسول ﷺ کو اللہ کا نبی مانتا ہے اور اس بات پر

Marfat.com

ایمان رکھتا ہے؛ جب تک کہ وہ آپ ﷺ کی زندگی کو اپنے لیے ایک نمونہ سمجھے جس کی اتّباع کرنا ضروری ہے۔

اُس کے بارے میں حکم جس نے شہادت سے انحراف کیا

ایسا شخص جو جانتے بوجھتے اور ارداتاً شہادت سے انحراف کرے وہ دائرۂ اسلام سے باہر ہے۔ اس نکتے پر تمام علما کا اتّفاق ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک شخص اللہ کی عبادت کے ساتھ کسی اور چیز یا ہستی کی عبادت کرتا ہے، جیسے عیسٰی علیہ السلام کی عبادت اللہ کے ساتھ کرنا، تو ایسا کرنے والا دائرۂ اسلام سے باہر ہو گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کا مُرتکب ہو یا رسول ﷺ کو نعوذُ باللہ جھوٹا کہے تو ایسے شخص نے شہادت کے دوسرے حصے کا انحراف کیا اور ایسا کرنے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہو گا۔

ایمان کی دوسری شاخوں کا کیا معاملہ ہے؟

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ ارکانِ اسلام کا ذکر فرماتے ہیں۔ لیکن آپ ﷺ ایمان کی باقی شاخوں کا تذکرہ نہیں کرتے جیسا کہ حدیثِ جبریل میں کیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ باقی تمام شاخوں کا شہادت کے دوسرے حصے میں احاطہ ہو گیا ہے۔ اگر ایک شخص آپ ﷺ کو اللہ کا رسول تسلیم کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اُن تمام تعلیمات پر ایمان رکھتا ہے جو آپ ﷺ کے ذریعہ سے ملیں۔ لہٰذا، ان میں ایمان کی وہ ساری شاخیں شامل ہیں جن کا ذکر آپ ﷺ نے حدیثِ جبریل میں فرمایا۔[1] دوسرے لفظوں میں یہ اقرار کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اپنے اندر ایمان کی باقی تمام شقوں کے اقرار کو لیے ہوئے ہے۔

---

[1] جیسا کہ، الشنقیطی، جلد 1، ص۔412۔

Marfat.com

''نماز قائم کرو''

صلوٰۃ (''نماز'') کے معنیٰ#

صلوٰۃ ایک ایسا لفظ ہے جو رسول اللہ ﷺ سے قبل بھی عربی زبان میں مستعمل تھا۔ بہر حال اسلام میں یہ لفظ ایک مخصوص اور مختلف معنی رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نماز کے مخصوص طریقے کو خود اپنے عمل سے سکھایا، آپ ﷺ نے فرمایا،

صلوا کما رایتمونی اصلی۔

''اس طرح نماز پڑھو جیسے تم نے مجھے نماز پڑھتے دیکھا۔''[1]

یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ صلوٰۃ کی بہت صاف تعریف موجود ہے، لیکن بعض اوقات کسی لفظ کے ماخذ اور اس کے فروعات کا علم اس لفظ سے وابستہ تصوّر پر روشنی ڈالتا ہے اور اسے واضح کرتا ہے۔ اس بات پر عمومی اتّفاق پایا جاتا ہے کہ لفظِ صلوٰۃ کے لُغوی معنی دعا کے ہیں، نماز میں بھی کئی دعائیں شامل ہیں۔[2]

---

[1] یہ اسلام میں سنت کی حیثیت کے بارے میں مضبوط ترین دلائل میں سے ایک دلیل ہے۔ سنت سے رجوع کیے بغیر کوئی نماز کے صحیح طریقے کو بھی نہیں جان سکتا، حالانکہ یہ اسلام کا ایک اہم ترین حصہ ہے۔ وہ جو کہ قرآن کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں مگر رسول اللہ ﷺ کی سنت کی پیروی سے انکار کرتے ہیں وہ محض اپنی جہالت کی رونمائی کرتے ہیں، کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی تشریح اور اسکے نفاذ کی طرف رجوع کیے بغیر یہ جانا جائے کہ قرآن کے نفاذ کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ حقیقت کہ قرآن خود رسول اللہ ﷺ کی پیروی اور اتباع کا حکم دیتا ہے۔

[2] حالانکہ صلوٰۃ کے معنی عمومی طور پر دعا سمجھے گئے ہیں، ابن الجوزی نے اس کے دیگر مخرجات بیان کیے ہیں۔ ایک تشریح یہ ہے کہ یہ لفظ اس محاورے صلیت الاود سے آیا ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس میں کوئی لکڑی کے ایک ٹکڑے کو جلا کر اسے نرم اور سیدھا کرتا ہے۔ وہ جو نماز پڑھتا ہے وہ اپنے آپ کو اللہ کے سامنے نرم کرتا اور جھکاتا ہے اپنی نماز کے ذریعے۔ قرطبی نے مزید چند مخرجات کا اضافہ کیا، جن میں یہ بھی شامل ہے کہ اس کا ماخذ ''استقامت اور تسلسل'' ہے۔ دوسرے لفظوں میں، اگر کوئی مسلسل آگ میں جلتا ہے تو اسے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ صلیا بالنار۔ اس طرح سے اس لفظ سے مراد، قرطبی کے مطابق، یہ ہے کہ ایک شخص اللہ کی عبادت تسلسل سے جاری رکھے اس طور پر کہ جیسا اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔ جیسا کہ عبد الرحمن ابن الجوزی، زاد

Marfat.com

41 حدیث نمبر3: "اسلام پانچ[ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے"

نماز اور دعا عبادت کے سب سے اہم پہلو ہیں۔ بندہ اپنے معبود کی جانب رُخ کرتا ہے اور اس سے سوال کرتا ہے اس نکتے پر محمد رشید رضا لکھتے ہیں،

نماز اپنے معبود کے سامنے اپنی ضرورت اور اس پر اپنے انحصار کو ظاہر کرنے کا نام ہے۔ یہ اظہارِ زبان، افعال یا دونوں سے ہو سکتا ہے۔ اس جملہ کا مفہوم "نماز کے معنی دعا کے ہیں" یوں ہے کہ جیسے کوئی شخص عظیم اور معزز ہستی کے سامنے اپنی حاجات کا اظہار کرتا ہے، چاہے یہ اظہار محض اپنی حرکات کے ذریعے ہی کیوں نہ ہو، جس کا مقصد کسی حاجت کو پورا کروانا، کسی نعمت کو جاری رکھوانا یا کسی سزا سے بچنا ہو سکتا ہے۔[1]

رشید رضا اسلام میں نماز کی ساخت یا شکل کے بارے میں لکھتے ہیں،

نماز کو اس تناظر میں جس کا ذکر ہم نے ابھی کیا[جبکہ ایک شخص اپنے ربّ کے حضور اپنی حاجت اور اس پر اپنے انحصار کو ظاہر کرتا ہے] اسلام میں بہترین طریقے سے واضح کیا گیا ہے۔ اور یہ نماز ہے جسے اللہ نے مسلمانوں کے لیے فرض کیا ہے۔ یہ جملے اور یہ حرکات جن کا آغاز تکبیرِ اُولیٰ، اللہُ اکبر کہنے کے ساتھ ہوتا ہے اور اختتام سلام پر ہوتا ہے۔ اس انداز میں جو سُنّت سے ثابت ہے، اگر ایک شخص اس نماز کو صحیح انداز میں قائم کرے، تو یہ اپنے معبود کے حضور اپنی اس حاجت کے اظہار کی بہترین شکل ہے۔ اس میں روح کا اظہارِ تعریف و تعظیم[اسکے لیے جسکی عبادت کی جارہی ہے] شامل ہے۔[2]

المیسر فی علم التفسیر (بیروت: دارالفکر، 1987)، جلد1، ص۔20؛ محمد قرطبی، جامی، لِاحکام القرآن (بیروت: دارالاحیالتراث العربی، تاریخ ندارد، جلد1، ص۔169)۔

[1] محمد رشید رضا، تفسیر القرآن الحکیم (بیروت: دارالفکر، تاریخ ندارد)، جلد1، ص۔128۔

[2] اسی کتاب میں، جلد1، ص ص۔129-128۔

Marfat.com

''نماز قائم کرنے'' کے معنی

ایک بہت اہم اور نوٹ کرنے کے لائق پہلو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث میں اور اسی طرح حدیثِ جبریل میں بھی صرف نماز ''ادا'' کرنے کا حکم نہیں ہے۔

الرّاغب الاسفہانی نشاندہی کرتے ہیں کہ اس سلسلے میں ''نماز ادا کرنے والا'' کے الفاظ قرآن میں بہت کم ہی ملتے ہیں، اُن چند مقامات میں سے کہ جہاں ''نماز ادا کرنے والے'' کا ہم معنی لفظ استعمال ہوا ہے ایک یہ آیت ہے،

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ۔ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۔

''پھر تباہی ہے اُن نماز پڑھنے والوں کے لیے۔ جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں (بے خبر ہیں)۔'' (الماعون:5-4)

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم محض نماز ادا کرنے کے عمل کیلئے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اِقامتُ صّلوۃ (نماز قائم کرنے) کی ذمہ داری سونپتا ہے۔ لہٰذا، اسلام کا ایک اہم رکن صرف نماز کی ادائیگی پر موقوف نہیں بلکہ اسکی ایک خاص نوعیّت ہے جسے اللہ اور اُسکے رسول ﷺ اِقامتُ صّلٰوۃ ''نماز کا قائم کرنا'' کہتے ہیں۔ صرف اس صورت میں جب کوئی شخص نماز مناسب اور درست طریقے سے ادا کرتا ہے تو وہ تعریف کے قابل ہے۔ لہٰذا، نماز ادا تو بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن اس کو قائم کرنے والے چند ہی ہوتے ہیں۔ یہ ویسی ہی صورت ہے جس کا اظہار حج کے متعلّق عمرؓ کے اس جملے میں ہوتا ہے، ''ان کی تعداد جنہوں نے حج کیا قلیل ہے جبکہ سوار (وہ جو حج پر موجود تھے) تو بہت سے تھے۔''[1]

الدواسیری نے ''نماز قائم کرنے'' اور ''نماز ادا کرنے'' کے درمیان فرق سے متعلّق ایک اور نکتے کی نشاندہی کی۔ انہوں نے کہا،

---

[1] جیسا کہ، الرّاغب الاسفہانی، معجم مفردات الفاظ القرآن (بیروت: دارالفکر، تاریخ ندارد)، ص۔433۔

Marfat.com

[اللہ تعالیٰ] نے "نماز ادا کرنے والے" نہیں کہا بلکہ "نماز قائم کرنے والے" کہا۔ اللہ تعالیٰ کی اس تفریق کا مقصد اصل نماز اور نماز کی طبعی شکل میں فرق کو واضح کرنا ہے۔ دراصل نماز دل اور روح کی نماز ہے؛ نماز جو انکساری کے ساتھ ہو، ان کی نماز جو خاموشی سے کھڑے ہوتے ہیں، اللہ کے حضور خشوع کے ساتھ۔[1] صرف نماز "اپنی طبعی صورت میں "اس حکم کی مصداق نہیں۔

یقیناً نماز کو قائم کرنے میں اس کے روحانی اور اندرونی پہلو کا قائم کرنا شامل ہے، جیسا کہ الداوسیری نے وضاحت کی۔ لیکن ان دونوں میں یقیناً صرف یہی ایک فرق نہیں جیسا کہ ہم اسلام کے اکابر اصحابِ علم کے ان بیانات میں دیکھ سکتے ہیں جو "نماز قائم کرنے" کی تعریف کے سلسلے میں سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن کے مشہور، مفسّر ابنِ جریر طبری لکھتے ہیں؛ "قائم کرنے کے معنی اسے اسکی متعیّن شدہ مناسب حدود کے مطابق ادا کرنا ہے، اس کے واجبات کے ساتھ، اوران واجبات کے ساتھ جن کا تعلّق اس شخص سے ہے جس پر یہ فرض کی گئی ہے۔" اس کے بعد وہ صحابیٔ رسول ﷺ ابنِ عباسؓ کا حوالہ دیتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا؛ "نماز قائم کرنا اسکے رکوع وسُجود اور تلاوت کو مکمل طور پر ادا کرنا ہے اور اسکے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کیلئے خشوع وخضوع کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔"[2] ابتدائی زمانے کے ایک صاحبِ علم قتادہ نے بھی کہا، "نماز قائم کرنا اسکے اوقات پر سختی سے عمل اور ان کی حفاظت، وضو، رکوع وسُجود ہیں۔"[3]

{وہ آیت جو صلوٰۃِ خوف کے سلسلے میں آئی ہے اس میں صلوٰۃ کا لفظ خوف کی حالت میں پڑھی گئی نماز کیلئے جبکہ ایک شخص کے لیے نماز کے تمام اراکین کو اطمینان کے ساتھ مکمل

---

[1] عبدالرّحمن الدوسیری، صفوت الآثار والمفاہیم من تفسیر القرآن العظیم (کویت: دارالارقم، 1981)، جلد2، ص۔8۔

[2] محمد ابنِ جریر الطبری، جامع البیان ان تاویلای القرآن (بیروت: دارالفکر، 1988)، جلد1، ص۔104۔

[3] حوالہ در ابنِ کثیر، جلد1، ص۔168۔

Marfat.com

طور پر ادا کرنا دشوار ہو گا۔ دوسری طرف قیام کا لفظ امن کی حالت میں نماز کیلئے استعمال ہوا ہے۔ جس سے قیام کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ (مترجم)}

امام رازی اس کے معنی کے سلسلے میں مندرجہ ذیل نتیجے پر پہنچے ہیں:

[قابلِ تعریف وہ لوگ قرار دیئے گئے ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں] یہ صرف ان لوگوں کیلئے ہے جو اسے مستقل قائم رکھتے ہیں کسی کمی کے بغیر اسکے تمام ارکان اور شرائط کو پورا کرتے ہوئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ سپاہیوں کی ضروریات پوری کرنے کے سلسلے میں "قائم کرنا"[1] استعمال ہوتا ہے۔ ضروریات کی تفصیل میں یہ شامل ہے کہ ہر ایک کے مکمل حقوق ادا کرنا ہے کسی کوتاہی یا کمی کے بغیر۔[2]

عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ نماز کو قائم کرنے کے معنی اسے مناسب طریقے سے ادا کرنا ہے، جیسا کہ قرآن اور سُنّت میں بیان ہوا ہے۔ اس میں نماز کے ظاہری اور باطنی دونوں پہلو شامل ہیں۔ دونوں میں سے کوئی پہلو بھی اپنے طور پر کافی نہیں، نماز کو مکمل طور پر قائم کرنے کیلئے نماز کے دوران طہارت کا موجود رہنا، اسکو صحیح وقت پر ادا کرنا، مردوں کیلئے اسے مسجد میں باجماعت ادا کرنا اور اسے ادا کرنے کے تمام اصول وضوابط کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے، اس کے ساتھ ساتھ خشوع، تسلیم، عجز، اطمینان جیسی کیفیات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ ضروری ہے کہ نماز بالکل اُسی طریقے کے مطابق ادا کی جائے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے عملی طور پر کر کے دکھایا۔ یہ سب کچھ نماز کے قائم کرنے میں شامل ہے۔ یہ سب نماز کیلئے جو کہ اسلام کی عمارت کی ایک اہم بنیاد ہے ضروری ہے۔

---

[1] یہ محاورہ اس کے لیے استعمال ہوتا ہے جو مہیا کرے یا "کھڑا کرے" سپاہیوں کو ان کے کھانے پینے اور ضروریات کی چیزوں کے ساتھ اور یہ اسی ماخذ سے ہے جس سے "نماز کا قائم کرنا" ہے۔

[2] الفخر الرّازی، التفسیر الکبیر (بیروت: داراحیاء التراث العربی، تاریخ ندارد)، جلد 2، ص۔ 29۔

Marfat.com

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ جس چیز کا ذکر فرمارہے ہیں وہ کوئی معمولی چیز نہیں، نہ ہی اسے غیر سنجیدہ طور پر لیا جاسکتا ہے۔ یہ اس بات کی متقاضی ہے کہ اسے اپنی استطاعت کے مطابق بہترین طریقے سے ادا کیا جائے، جو سُنّت رسول اللہ ﷺ کے مطابق بھی ہو، اسکے لیے نیّت بھی درست ہو اور نماز میں دھیان بھی درست جانب رہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ نماز اسلام کا ایک ایسا مخصوص ستون ہے کہ اگر ایک شخص اسے مناسب اور درست انداز سے ادا کرتا ہے تو یہ کہا جائیگا کہ اس نے "نماز ادا کی" اور اس نے "نماز قائم کی"۔ لیکن اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو پھر جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے اشارہ فرمایا، یہ کہا جائیگا کہ یہ عمل ضائع ہوا۔ ایک وہ واقعہ ہے جس میں آپ نے مسجد میں ایک شخص کو تین بار ٹوکا جبکہ اس نے نماز مناسب طریقے سے ادا نہ کی اور فرمایا،

ارجع فصل فانک لم تصل۔

"جاؤ اور پھر نماز پڑھو کیونکہ تم نے نماز نہیں پڑھی۔" (البخاری و مسلم)

یہ ممکن ہے کہ اگر کسی حد تک نماز کے قیام کے لوازم کو پورا کر دیا تو قانونی طور پر فرض ادا ہو گیا، ہاں جہاں تک اسکی جزا کا معاملہ ہے ایسے عمل میں کمی رہ گئی، جسکے متعلّق رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے،

ان الرجل لینصرف وما کتب لہ الا عشر صلاتہ تسعھا ثمنھا سبعھا سدسھا خمسھا ربعھا ثلثھا نصفھا۔

"ایک شخص اس (نماز) سے سب کچھ مکمل کر لے اور جو کچھ لکھا جائے وہ اسکا دسواں حصہ، نواں حصہ، آٹھواں حصہ، ساتواں حصہ، چھٹا حصہ، پانچواں حصہ، چوتھا حصہ، تیسرا حصہ، یا آدھا ہو۔"[1]

یہاں "نماز کو قائم کرنے" کے معنوں پر زور اس لیے دیا گیا ہے کہ دراصل یہی [قائم کرنا]، دینِ اسلام ہے۔ یہ رُکن صرف نماز ادا کر دینا نہیں۔ نہ ہی اس سے مراد اسے کسی بھی

---

[1] اسے ابوداؤد اور احمد نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامی، جلد 1، ص۔355۔

Marfat.com

طرح سے ادا کر دینا یا محض چند حرکات کا کر لینا ہے۔ نہ ہی یہ صرف دل میں ادا کر لینا ہے جس کے ساتھ کوئی جسمانی عمل شامل نہ ہو۔ نہ ہی یہ اپنی سہولت کے اوقات میں نماز کا پڑھ لینا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ اسلام کے اس رُکن کو احتیاط کے ساتھ بہترین اور درست طرز پر ادا کیا جائے۔ اس نکتے پر ابوالحَسَن علی ندوی لکھتے ہیں،

نماز بدن کی چند مخصوص حرکات کا نام نہیں۔ نہ ہی یہ لکڑی کی بنی ہوئی کوئی بے جان سی رسم ہے یا فوجی نظم کی طرح کوئی چیز ہے جس میں کسی کی مرضی کی یا اس کو توڑنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہ تو ایک ایسا عمل ہے جس میں انسانی وجود کے تینوں پہلو یعنی طبعی، عقلی اور روحانی پہلو اپنا مناسب حصہ پاتے ہیں۔ بدن، دماغ اور دل اس میں ایک ساتھ بہترین طرز سے سر بعمل ہوتے ہیں۔ سیدھے کھڑے ہونا، قعدے میں بیٹھنا اور سجدہ کرنا بدن سے متعلّق ہیں، تلاوت زبان کا کام ہے، غور و فکر کرنا دماغ کا جبکہ خشوع، توبہ اور دل کی گریہ وزاری دل کے۔۔۔۔

لہٰذا شخصیت کے کئی پہلو ہوتے ہیں یہ بدن، دماغ اور دل سے مل کر بنتی ہے۔، نماز انسان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کی نمائندہ ہوتی ہے اور نماز ایمان کا سب سے نمایاں مظہر ہے۔ چند مذاہب کے فُقہا، عابد وزاہد افراد اور دورِ آخر کے یہود اس میں صرف طبعی پہلو کو ہی دیکھتے ہیں۔ جبکہ اہلِ مشرق کے صوفیا اور مفکرین میں ایسے لوگ ہیں جو اسے محض غور و فکر اور مراقبت سمجھتے ہیں۔ مزید یہ کہ ایک بے علم عیسائی راہب اور ایک ایسا شخص بھی جو درویش صفت مسلمان کہلاتا ہے یہ تصوّر رکھتا ہے کہ یہ صرف ایک علاماتی فعل ہے محبّت اور جانثاری کا دل آویزی اور تعظیم کا، گرم جوشی اور تقلید کا، غم اور دل شکستگی کا، خوف اور توبہ کا۔ یہ لوگ وہیں تک پہنچے جہاں تک اُنکے تصوّر نے اجازت دی۔

Marfat.com

بہر حال تھوڑی سی ذہنی کاوش اس بات کا پتہ دے گی کہ صد افسوس یہ لوگ بھٹکے ہوئے اور علم سے بے بہرا تھے۔ جن پر قیامِ نماز کی ترویج کی عظمت اور وسعت ظاہر نہ ہوئی۔[1]

نماز کی اہمیت

اسلام میں نماز کی اہمیت کسی تعارُف کی محتاج نہیں۔ یہ اسلام کا وہ پہلا رُکن ہے جس کا ذکر آپ ﷺ نے اُس کلمۂ شہادت کے بعد کیا جس کے ذریعے ایک شخص مسلمان ہوتا ہے۔ نماز تمام انبیا پر فرض تھی اور تمام انسانوں پر بھی فرض رہی، اللہ تعالیٰ نے اس کی فرضیت کا اعلان انتہائی غیر معمولی اور بہت عظیم الشان ماحول میں کیا۔ مثلاً جب اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے تو فرمایا،

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى۔ اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ۔

"اور میں نے تجھ کو چن لیا ہے، سُن جو کچھ وحی کیا جاتا ہے۔ میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی خدا نہیں ہے، پس تو میری بندگی کر اور میری یاد کے لیے نماز قائم کر۔"(طٰہٰ:-13 14)

اسی طرح سے رسول اللہ ﷺ پر معراج میں نماز فرض کی گئی، جب آپ ﷺ کو آسمانوں پر لے جایا گیا۔ مزید یہ کہ جب اللہ تعالیٰ مومنین کی تعریف کرتے ہیں مثلاً سورۃ المومنون کے شروع میں تو ان کی پہلی صفت ان کا نمازی ہونا ہی بتاتے ہیں۔

ایک بار کسی شخص نے رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ نیکی کے عمل کے بارے میں پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا سب سے بڑی نیکی نماز ہے۔ اس شخص نے کئی بار یہ سوال

---

[1] ابوالحسن علی ندوی، اسلام کے چار ارکان، لکھنو، بھارت ادارۂ تحقیق وطباعت اسلامی، 1967)، ص ص۔22-23۔

Marfat.com

دہرایا۔ آپ ﷺ نے پہلی تین بار اس سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا نماز، چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا "جہاد فی سبیل اللہ۔"[1]

نماز کی اہمیت کے بارے میں ہمیں رسول اللہ ﷺ کی کئی احادیث سے پتا چلتا ہے۔ مثلاً آپ کا قول کہ،

اول ما یحاسب بہ العبدیوم القیامۃ الصلاۃ فان صلحت صلح سائر عملہ وان فسدت فسد سائر عملہ۔

"روزِ قیامت وہ پہلی چیز جس کا حساب لیا جائیگا وہ نماز ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو اس کے باقی اعمال بھی صحیح ہیں اگر یہ خراب ہے تو باقی سارے اعمال بھی خراب ہیں۔"[2]

نماز کی اہمیت کو سمجھنے کے لیے اس حقیقت کو سمجھ لیجئے کہ جو کوئی عمل ایک شخص کرتا ہے اس میں سب سے اہم پہلو اللہ کے ساتھ اس کا تعلّق ہے، یعنی اُس شخص کا ایمان، تقویٰ، اخلاص اور اللہ کی عبادت۔ اللہ سے تعلّق کا اظہار اور اُسکی عملی شکل نماز ہے اور اس کے ذریعہ یہ تعلّق نشوونما بھی پاتا ہے۔ اس لیے اگر نماز صحیح ہے اور درست طریقے سے ادا ہوئی ہے تو باقی اعمال بھی صحیح ہونگے اور درست طریقے پر ہونگے؛ اس کے برعکس اگر نماز صحیح نہیں اور درست طریقے سے ادا نہیں کی جاتی تو باقی اعمال بھی صحیح نہیں ہوں گے اور درست طریقے سے نہیں کیے جائینگے۔ رسول اللہ ﷺ نے خود فرمایا،

درحقیقت، اگر نماز کو درست طور پر ادا کیا جائے اللہ تعالیٰ کی سچّی یاد اور مغفرت کیلئے، اسکی طرف رخ کرکے۔ ایک انسان پر اس کا دیرپا اثر ہوگا۔ جب وہ نماز مکمل کرلے گا اس کے بعد بھی اس کا دل اللہ کی یاد سے پُر رہے گا۔ وہ اللہ سے ڈرے گا اور اس سے اُمید بھی

---

[1] یہ ایک حدیث میں ہے جسے احمد اور ابنِ حبّان نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ حسن حدیث ہے۔ محمد ناصر الدین الالبانی، صحیح الترغیب والترہیب (بیروت: المکتب الاسلامی، 1982)، جلد 1، ص۔150۔

[2] اسے الطبرانی نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامی، جلد 1، ص۔503۔

Marfat.com

رکھے گا۔ اس تجربے کے بعد وہ اپنے اس اعلیٰ درجے سے ایک کمتر درجے پر نہیں آئے گا جہاں وہ اللہ کی نافرمانی کا مرتکب ہو۔

اللہ تعالیٰ نے نماز کے اس پہلو کو بیان فرمایا جب اللہ نے فرمایا،

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ۔

" یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔ "(العنکبوت:45)۔ابو الحسن علی ندوی نے اس اثر کو بہت خوبصورت انداز میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا،

> اس کا مقصد انسان کے باطنی نفس میں ایسی روحانی قوّت، ایمان کی روشنی اور معرفتِ الٰہی کو جِلا بخشنا ہے جو کہ اُسے ہر قسم کی بُرائیوں اور شہوات کا کامیابی سے مقابلہ کرنے کے قابل بنتے ہیں اور اسے آزمائش اور سختی میں ثابت قدم رکھتے ہیں اور حفاظت کرتے ہیں اسکے گوشت پوست کے جسم کے کمزوری دکھانے سے اور اسکے غیر معتدل حرص کے فساد سے۔[1]

مناسب طور پر ادا کی گئی نمازوں کے ازمانوں پر مجموعی اثر کا بیان قرآنِ پاک کی کئی دوسری آیات میں آیا ہے،

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ ھَلُوْعًا۔ اِذَا مَسَّہُ الشَّرُّ جَزُوْعًا۔ وَّ اِذَا مَسَّہُ الْخَیْرُ مَنُوْعًا۔ اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ۔ الَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلَاتِھِمْ دَآئِمُوْنَ۔

"انسان تھڑادِلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے۔ اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ جو اپنی نماز کی ہمیشہ پابندی کرتے ہیں۔"(المعارج:19-23)

[1] ندوی، ص۔24۔

Marfat.com

جہاں تک آخرت کا تعلّق ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اسکی وفا کا نماز سے بہت قریبی تعلّق ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا،

خمس صلوات افتر ضهن اللّٰہ تعالیٰ من احسن وضوءهن وصلاهن لوقتهن واتم رکوعهن وخشوعهن کان لہ علی اللّٰہ عهدان یغفر لہ ومن لم یفعل فلیس لہ علی اللّٰہ عهد ان شاء غفر لہ وان شاء عذبہ

''اللہ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جو کوئی بھی انکے لیے احسن طریقے سے وضو کرے گا اُنہیں اُنکے مقرّرہ اوقات پر ادا کرے گا، اُن کے رکوعات اور خشوع کی تکمیل کریگا۔[1] اس سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اسکی مغفرت فرمائے گا۔ اور وہ جو یہ کچھ نہیں کرے گا اس سے اللہ کا کوئی وعدہ نہیں کہ اسے معاف کرے یا اُسے سزا دے۔''[2]

انسان کیلئے نماز پاکیزگی کا سامان ہے۔ وہ دن میں پانچ بار اپنا رُخ اپنے ربّ کی جانب کر کے اس سے ملاقات کرتا ہے، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا۔ اس کا بار بار ایسا کرنا اور اللہ کے سامنے کھڑا ہونا اسے پورے دن کے دوران گناہ کے کاموں سے روکتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ اوقات اسکے لیے ندامت اور توبہ کے مواقع فراہم کرتے ہیں، اسطرح سے وہ صدقِ دل سے ان گناہ کے کاموں کے لیے مغفرت مانگتا ہے جو اس سے سرزد ہوئے ہوں۔ اس پر یہ اضافہ کہ نماز بذاتِ خود ایک نیکی ہے جو ایسے کئی برے کاموں کو مٹا دیتی ہے جو اس سے سرزد ہوئے ہوں۔ ان نکات کو ذیل میں دی گئی حدیثِ رسول ﷺ میں نوٹ کیا جا سکتا ہے،

ارایتم لو ان نهراً بباب احدکم یغتسل فیہ کل یومٍ خمسا ما تقول ذلک یبقی من درنہ قالوا لا یبقی من درنہ شیئاً قال فذلک مثل الصلوات الخمس یمحو اللّٰہ بہ الخطایا۔

---

[1] نماز میں خشوع یہ ہے کہ ایک شخص کا دل نماز میں محو ہو جائے۔ اس کے بعد دل کی یہ کیفیت جسم سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایسا شخص ہلے جُلے بغیر سکون سے رہتا ہے۔ اس کی نظریں بھی جھکی ہوئی ہوتی ہیں حتّٰی کہ اس کی آواز پر بھی دل کی اس کیفیت کا اثر ہوتا ہے۔ اس تصور کے بارے میں مزید تفصیل کے لیے (اور اس کے اور خضوع کے درمیان فرق کے لیے) دیکھیں محمد الشائی، الفروق اللغویۃ واطہارایا تفسیر القرآن الکریم (ریاض: مکتبہ الابیکان، 1993)، ص ص۔ 254-249۔

[2] اسے مالک، احمد، ابوداؤد، النسائی وغیرہ نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامی، جلد 1، ص۔ 616۔

Marfat.com

 حدیث نمبر3: "اسلام پانچ[ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے"

"'اگر کسی شخص کے گھر کے باہر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ وقت نہائے کیا تم سمجھتے ہو اس پر کوئی گندگی باقی رہ جائیگی؟' لوگوں نے کہا 'اس پر کچھ گندگی باقی نہیں رہے گی' اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا 'یہ پانچ نمازوں کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہاری خطاؤں کو اسی طرح صاف کرتا ہے۔'" (البخاری و مسلم)۔ ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،

الصلوات الخمس والجمعة الى الجمعة كفارات لما بينهن۔

"روزانہ کی پنجگانہ نماز اور جمعہ کی نماز سے اگلی جمعہ کی نماز تک ان کے درمیان جو کچھ ہو اسکے لیے کفارہ ہیں۔" (مسلم)

آخر میں سعدی کی یہ نشاندہی کہ نماز میں کسی شخص کے لیے اس دنیا اور آخرت میں اچھائی کمانے کا ذریعہ ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیت کا حوالہ دیا،

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ۔

"صبر اور نماز سے مدد لو۔" (البقرہ:45)

اور کہا کہ اس آیت کا اطلاق کسی بھی معاملے میں صبر اور نماز سے مدد لینے پر ہوتا ہے۔ کسی شخص کے دینی معاملات میں؛ اگر تو وہ اپنی نماز میں استقلال رکھتا ہے اور اسے باقاعدگی سے ادا کرتا ہے تو ایسے شخص کو دیگر نیکی کے اعمال کرنے میں آسانی ہوگی، کیونکہ اسے ایسے کاموں سے روحانی تسکین ملے گی اور وہ ان کیلئے اللہ سے جزا کا امیدوار ہوگا، اسی طرح نماز اسکی ان نفسانی خواہشات اور رجحانات کو کم کرے گی جو بُرائی کی طرف مائل کرتے ہیں۔ دنیاوی اعتبار سے بھی، نماز اس کے لیے زندگی میں پیش آنے والی مشکلات اور سختیوں کو برداشت کرنا آسان بنادے گی، اللہ تعالیٰ نماز کی وجہ سے اسکے معاملات میں آسانی فرمائینگے اور اسکے رِزق میں اور اسکے اعمال میں برکت ڈال دینگے۔[1]

---

[1] عبدالرحمن السعدی، الریاض الناضرہ والحدائق النیرۃ الظاہرہ فی العقائد والفنون المتنوعۃ الفاخرۃ (ریاض: رمادی للنشر، 1996)، ص ص۔ 26-27۔

Marfat.com

نماز نہ پڑھنے والے کے متعلّق حکم

اسلام کے اس نہایت اہم رُکن کو ادا نہ کرنے والے کے بارے میں اصحابِ علم اختلافی آراء رکھتے ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ آیا نماز ادا نہ کرنے والا دائرۂ اسلام سے باہر نکل جاتا ہے یا نہیں۔ یعنی نماز نہ پڑھنے کی صورت میں کیا ایک شخص کافر ہو جاتا ہے؟ عمومی طور پر بے نمازیوں کو مندرجہ ذیل گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:[1]

(1) جن کے بارے میں یہ اتّفاق ہے کہ ایسے لوگ کافر نہیں ان میں وہ لوگ شامل ہیں جنکی نماز بھول جانے یا سوتے رہ جانے کی وجہ سے ضائع ہو گئی۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں کے متعلّق یہ نہیں کہا جائیگا کہ وہ کافر ہیں۔

(2) جن کے بارے میں یہ اتّفاق ہے کہ ایسے لوگ کافر ہیں۔ اس گروہ میں کئی ذیلی گروہ شامل ہیں جو درج ذیل ہیں:

(i) وہ جو نماز ادا نہیں کرتا اور نماز کے فرض ہونے کو ہی مسترد کر دیتا ہے۔ اس بات پر اتّفاق ہے کہ ایسا شخص کافر ہے کیونکہ اس نے قرآن اور سُنّت کے بیشمار مصمّم ثبوت مُسترد کر دیئے۔

(ii) وہ جو نماز ادا کرنے سے غرور یا حسد کی بنا پر انکار کرتا ہے یہ وہ شخص ہے جو اسلام کی حقّانیت کا قائل ہے لیکن اِسکے باوجود اُسکے احکام ماننے اور نماز ادا کرنے سے اسلام سے اپنی نفرت کے باعث مُنحرف ہے اور وہ ایسا یا تو اپنے اس غرور کے تحت کرتا ہے کہ وہ نہیں سمجھتا کہ اُسے ایسا عمل کرنے کی کوئی ضرورت ہے یا اسی طرح کی کسی اور وجہ سے وہ نماز نہیں پڑھتا۔

---

[1] جیسا کہ، عبداللطیف، ص ص۔455-452۔

Marfat.com

(iii)ایسا شخص جو اپنی نماز کی تحقیر کرتا ہے اور بے وقعت سمجھ کر اسے ادا نہیں کرتا۔ ایسا شخص اسلام کے ایک اہم رُکن کی بے توقیری یا اُسکی تحقیر کا مُرتکب ہوتا ہے اور ایسا کرنا اسے دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

(iv)ایسا شخص جو حُکام کی تنبیہ کے باوجود اگر نماز ادا نہ کرے گا تو اسے موت کی سزا دی جاسکتی ہے ۔جو نماز نہ پڑھے ایسا شخص غیر مسلم تصوّر کیا جائیگا کیونکہ اس نے سزائے موت کی دھمکی کے باوجود اپنی روش نہ چھوڑی۔

(v)ایسا شخص جو نماز کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتا ہے یہ جانے بغیر کہ یہ فرض ہے یا اسے فرض ماننے سے انکار کر دیتا ہے۔

(3)تیسری قسم کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اختلاف اس بات پر ہے کہ آیا ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہے یا نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نماز کی فرضیت کو تو مانتے ہیں اور اُسکی اہمیت سے بھی انکار نہیں کرتے۔ مزید یہ کہ اس بات کا بھی احساس رکھتے ہیں کہ نماز نہ پڑھ کر وہ گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ مگر اپنی سُستی کی وجہ سے نماز ادا نہیں کرتے۔ بعض اصحابِ علم کے مطابق ایسا شخص اسلام سے مکمل طور پر خارج ہو گیا، اور وہ ہمیشہ کیلئے جہنّم کا حقدار ہو گا یہاں تک کہ مسلمانوں کو اس کی نمازِ جنازہ بھی نہیں پڑھنی چاہیے۔ کچھ اور اصحابِ علم یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایسا شخص یقیناً گناہگار ہے وہ چھوٹا کفر کر رہا ہے اور ایسا کرنا اسے اس دروازے پر لے جاتا ہے جہاں سے وہ اسلام سے خارج ہو سکتا ہے لیکن ایسا شخص اسلام کے عمومی دائرے سے باہر نہیں نکلا اور اسے ایک کافر کی حیثیت سے نہیں برتا جائیگا۔

اس نہایت اہم مسئلے پر تفصیلی بحث کا یہاں موقع نہیں۔[1] اس رائے کے حق میں کہ ایسا شخص کافر ہو گیا رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث سب سے وزن دار ثبوت ہے،

---

[1] اس نکتے پر ایک بہت عمدہ بحث دیکھی جاسکتی ہے، العبد الطیف، ص ص۔498-456 پر۔ متعدد احادیث کے بارے میں صحابہ کے اور دیگر اشخاص کے بیانات صاف طور پر بتاتے ہیں کہ نماز کو چھوڑنا کفر کے مترادف ہے۔ دیکھیں عبید اللہ ابن بطہ، الابانۃ عن شریعۃ الفرق الناجیۃ ومجانبۃ الفرق المذمومۃ (ریاض: دارالرایۃ، 1988)، جلد2، ص ص۔684-669۔ ابن عثیمین ایک ایسے عالم

Marfat.com

ان بین الرجل وبین الشرک والکفر ترک الصلاۃ۔

"ایک شخص کے اور شرک وکفر کے درمیان فرق نماز کا ترک کرنا ہے۔" (مسلم)

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے تخصیص کے ساتھ الشرک اور الکفر کا استعمال کیا یہ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جو معروف تھی اور سمجھی جاتی تھی۔ کفر کو ایسے ہی سمجھا جاتا ہے کہ یہ وہ حالت ہے جو دائرۂ اسلام سے باہر ہے۔ مزید یہ کہ شرک اور کفر دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ایسا کرنا ایک شخص کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں،

العھد الذی بیننا وبینھم الصلاۃ فمن ترکھا فقد کفر۔

"ہمارے اور ان [کُفّار] کے درمیان جو عہد ہے یعنی نماز۔ جس نے اسے چھوڑا اس نے کفر کا عمل کیا۔"[1] ایک اور حدیث میں آپ ﷺ فرماتے ہیں،

لاتترک صلاۃ مکتوبۃ متعمدًا فمن ترکھا متعمدًا فقد برئت منہ الذمۃ۔

"فرض نماز مت چھوڑو۔ کیونکہ جو اسے قصداً ادا نہیں کرتا اپنے آپ کو اللہ اور اسکے رسول سے آزاد کر لیتا ہے۔"[1]

ہیں جو یہ نظریہ رکھتے ہیں کہ تارکِ صلاۃ خارجِ دین ہے ان کے دلائل دیکھے جاسکتے ہیں، محمد ابنِ عثیمین، حکم تارکِ الصلاۃ، (Fairfax,VA,IIASA, تاریخ ندارد)، جابجا۔ الالبانی کہتے ہیں کہ ایسا شخص کافر نہیں۔ ان کے دلائل کو ایک کتاب میں دیکھا جاسکتا ہے جس کا نام بھی وہی ہے، محمد ناصر الدین الالبانی، حکم تارک الصلاۃ (ریاض: دارالجلالین، 1992)، جابجا۔ انگریزی زبان میں ایک مختصر بحث میں کچھ دیگر متعلقہ دلائل کے بارے میں بحث کو دیکھا جاسکتا ہے۔ السیّد سابق، فقہ سنۃ (Indianaplis: American Trust Publication, 1985) Vol 1, pp.77-80)، مصنف {جمال زرابوزو} کا ثانی نظریہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص نماز کو ترک کرتا ہے، وہ ایک کفر کا عمل کرتا ہے جو اُسے دائرِ اسلام سے باہر لے جاتا ہے اگر اُسے اس حقیقت کے متعلق علم ہے۔

[1] اسے الترمذی، النسائی، ابنِ ماجہ اور احمد نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ صحیح ہے۔ دیکھیں الالبانی، صحیح الجامی، جلد 2، ص۔760۔

Marfat.com

اس رائے کی تائید میں کہ تارکِ صلوٰۃ اسلام سے خارج نہیں ہوتا ایک بہت مضبوط دلیل یہ مشہور حدیث ہے جو پچھلے صفحات میں بھی بیان کی گئی ہے،

خمس صلوات افترضهن اللّٰہ تعالیٰ من احسن وضو ءهن وصلاهن لوقتهن واتم رکوعهن وخشوعهن کان له علی اللّٰہ عهد ان یغفرله ومن لم یفعل فلیس له علی اللّٰہ عهد ان شاء غفر له وان شاء عذبہ۔

"اللہ نے پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جو کوئی بھی اس کے لیے احسن طریقے سے وضو کرے گا انہیں اُن کے مقررہ اوقات پر ادا کرے گا، اُن کے رکوعات اور خشوع کی تکمیل کریگا۔ اس سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اس کی مغفرت فرمائے گا۔ اور وہ جو یہ کچھ نہیں کرے گا اس سے اللہ کا کوئی وعدہ نہیں کہ اسے معاف کرے یا اُسے سزا دے۔"[2]

بہر حال یہ اہم ہے کہ ہم ان نتائج کو نوٹ کریں جن پر دونوں قسم کی آراء رکھنے والے اصحابِ علم پہنچے۔ وہ جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایسا شخص واجب القتل ہے کیونکہ وہ مُرتد ہو گیا، اگر وہ توبہ نہیں کرتا، (نوٹ: یہ کوئی ایسا معاملہ نہیں کہ اس پر انفرادی طور پر عمل کیا جائے، حتٰی کہ تاریخِ اسلام کے کسی دور میں بھی نا تو اس قسم کی قانوناً سزا کی گئی نا ہی ایسی سزا دی گئی) اور وہ اصحابِ علم جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ ایسا شخص دائرۂ اسلام سے باہر نہیں ہوا ان کی اکثریت یہ کہتی ہے کہ اسے نماز کا حکم دیا جائیگا اور اگر وہ نماز سے انکار کرتا ہے تو اس کی پاداش میں اس کی سزا موت ہے۔[3] لہٰذا اصحابِ علم کی اکثریت ایک ہی نتیجہ نکالتی ہے۔ اسلام کے اس نہایت اہم رکن سے روگردانی ایسا گھناؤنا عمل ہے کہ یہ اصحابِ علم اس بات پر متفق ہیں کہ ایسا شخص زندہ رہنے کے لائق نہیں۔ لہٰذا، اس بات سے قطع نظر کہ ان اصحابِ علم کی رائے کو تسلیم کیا جائے جو کہتے ہیں کہ ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج ہو گیا یا

---

[1] ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کو ابنِ ماجہ اور احمد نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ دیکھیں الالبانی، صحیح الترغیب، جلد 1، ص۔299۔

[2] اسے مالک، احمد، ابوداؤد، النسائی وغیرہ نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجانی، جلد 1، ص۔616۔

[3] بعض احناف کی رائے میں ایسے شخص کو قید کر دینا چاہیے اور اُسے توبہ کرنے کا مشورہ دیا جانا چاہیے۔

Marfat.com

ان کی رائے کو جو کہتے ہیں کہ اسلام سے خارج نہیں ہوا، اس بات پر دونوں گروہ متفق ہیں کہ نماز کی اہمیت بہت زیادہ ہے اور ایک مسلمان جو اسلام پر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کبھی اس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا کہ نماز پڑھنا چھوڑ دے۔ صدیقی کے مندرجہ ذیل الفاظ نماز کی اہمیت کے سلسلے میں اس پوری بحث کا نچوڑ پیش کرتے ہیں،

نماز دین کی روح ہے۔ جب نماز موجود نہیں تو روح کی پاکیزگی نہیں۔ ایک نماز نہ پڑھنے والے کو بے روح فرد کہنا درست ہو گا۔ نماز کو اس دنیا سے ہٹا دیجئے تو دین ہی ختم ہو جائیگا کیونکہ یہ نماز ہے جس کی وجہ سے انسان میں اللہ کا تقویٰ ہے اور انسانیت سے بے لوث محبّت ہے اور نیکی کا باطنی احساس ہے، لہٰذا، نماز سب سے پہلے سب سے اونچی اور دین کے برتنے کا سب سے مصدِّقہ نمونہ ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے اسلام میں نماز کی حیثیت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا،

راس الامرالاسلام وعموده الصلاة وذروة سنامه الجهاد۔

"اسلام تمام معاملات کا سر ہے اسکا ستون نماز ہے اور اس کی چوٹی جہاد ہے۔"[2]

"زکوٰۃ ادا کرنا"

زکوٰۃ کے معنی

لغوی اعتبار سے لفظ زکوٰۃ کا ماخذ پاکیزگی، برکت اور اضافے کا مظہر ہے، اللہ تعالیٰ قرآنِ پاک میں اعلان کرتے ہیں،

---

[1] صدیقی، جلد 1، ص۔206۔

[2] ایک مستند حدیث جسے احمد، الترمذی وغیرہ نے محفوظ کیا۔

Marfat.com

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی۔

"فلاح پا گیا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔"(الاعلیٰ :14)

قرآن اور حدیث میں زکوٰۃ کیلئے استعمال ہونے والا لفظ 'صدقہ' ہے۔ اس لفظ کا ماخذ صِدق (سچائی) ہے۔ صدیقی نے ان دونوں اصطلاحات کی تفسیر ان الفاظ میں کی،

یہ دونوں الفاظ اپنے معنوں میں بہت بھرپور ہیں۔ اللہ کی خاطر مال خرچ کرنے سے انسان کا دل مال ومتاع کی محبّت سے پاک ہوتا ہے۔ جو شخص اسطرح خرچ کرتا ہے وہ اپنے ربّ کے حضور ایک ادنٰی سا تحفہ پیش کرتا ہے اور اس سچّائی کا اعادہ کرتا ہے کہ زندگی میں کوئی چیز اللہ کی محبّت سے زیادہ عزیز نہیں اور یہ کہ وہ اس کے لیے کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔[1]

شرعی اعتبار سے اس کے فقہی معنی اپنے متفرّق اموال میں سے ایک مخصوص حصے کا سالانہ چند مخصوص اقسام کے افراد کو دینا ہے۔

زکوٰۃ کی اہمیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ ارکانِ اسلام میں زکوٰۃ کا مقام نماز کے بہت قریب ہے ان دونوں کا تذکرہ قرآن میں اکثر مقامات پر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے۔ ایسے مقامات کی ٹھیک تعداد 82 ہے۔

اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کو مشرکین سے جہاں کہیں ممکن ہو جنگ کا حکم دیتا ہے،

---

[1] صدیقی، جلد2، ص۔465۔

Marfat.com

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَ خُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

"پس جب حرام مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو قتل کرو جہاں پاؤ اور انہیں پکڑو اور گھیرو اور ہر گھات میں اُن کی خبر لینے کے لیے بیٹھو۔ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو انہیں چھوڑ دو۔ اللہ درگزر فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔" (التوبہ:5)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ صحابہ کرام کو ان سے جنگ کا حکم دیتا ہے دراں حالیکہ وہ توبہ کرلیں۔

نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں۔

اس آیت سے کچھ آگے اسی سورۃ میں اسی معاملہ کے بیان کو آگے بڑھاتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔

"پس اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور جاننے والوں کے لیے ہم اپنے احکام واضح کیے دیتے ہیں۔" (التوبہ:11)۔

یہ دونوں آیات اللہ کے ہاں زکوٰۃ کی اہمیت کا بیّن ثبوت ہیں۔ کُفّار اس دین میں داخل ہو جائینگے اگر وہ توبہ کریں گے، نماز ادا کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ لہٰذا، زکوٰۃ کا دینا ایک مسلمان ہونے کیلئے اور اس بات کیلئے کہ وہ اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر رہا ہے ایک نشانی ہے۔

قرآنِ پاک میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آخرت میں اللہ کی رحمت کا مستحق ہونے کے لیے زکوٰۃ ادا کرنا کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ سورۃ التوبہ کی آیت نمبر 71 میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

Marfat.com

وَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَ يُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔

"مومن مرد اور مومن عورتیں، یہ سب ایک دوسرے کے رفیق ہیں، بھلائی کا حکم دیتے اور بُرائی سے روکتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی رحمت نازل ہو کر رہے گی، یقیناً اللہ سب پر غالب و حکیم و دانا ہے۔" (التوبہ:71)

زکوٰۃ کا ادا کرنا ایک انسان کو اور اس کے مال کو بھی پاک کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ سے فرمایا،

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَ تُزَكِّيْهِمْ بِهَا۔

"اے نبی ﷺ، تم ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں پاک کرو۔" (التوبہ:103)

مزید یہ کہ زکوٰۃ اہلِ ایمان کے دلوں کی روحوں کو پاکیزگی عطا کرتی ہے اور ان کے دلوں سے کنجوسی اور بخل کی بیماریوں کو دور کرتی ہے۔

زکوٰۃ ایک انسان کے مال کی پاکیزگی کا ذریعہ بھی ہے اور اس میں موجود بُرے اثرات کو دور کر دیتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار یوں فرمایا،

من ادى زكاة ماله فقد ذهب عنه شره

"جو کوئی اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو ایسا کرنا اس میں موجود بُرے اثرات کو دور کر دیتا ہے۔"[1]

مجموعی طور پر معاشرے کیلئے بھی زکوٰۃ کا ایک اہم کردار ہے۔ اس پہلو سے چند نمایاں اُمور کا یہاں تذکرہ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر، زکوٰۃ معاشرے کے معاشی طور پر کمزور

[1] اسے ابنِ خزیمہ اور الطبرانی نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ حسن ہے۔ الالبانی، صحیح الترغیب والترہیب، جلد 1، ص۔ 312

Marfat.com

افراد کیلئے مدد کا ذریعہ ہے۔ اس سے انہیں اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے جو مال درکار ہے موصول ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ مسلم معاشرے میں آپس کے برادرانہ تعلّقات مضبوط ہوتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ مستحق افراد جانتے ہیں کہ امیر افراد زکوٰۃ اور صدقات کے ذریعے ان کی مدد کو آئیں گے۔ وہ افراد بھی جو بہت زیادہ امیر و کبیر نہیں ہوتے اس کے ذریعہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب پاتے ہیں۔ انہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان صدقات کے دینے سے نہ تو وہ بھوکے رہیں گے نہ فنا ہونگے اس لیے وہ اپنے مال میں سے کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ مزید یہ کہ اہلِ ثروت میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ یہ مال جو ان کے پاس ہے اللہ کی جانب سے ایک انعام ہے۔ لہٰذا، اس کا استعمال ان راستوں میں ہونا چاہیے جو اللہ کی خوشنودی کا باعث بنیں اور ایک نہایت اہم کام جس کا کرنا اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا باعث بنتا ہے وہ اپنے مال پر زکوٰۃ ادا کرنے کی ذمہ داری کا پورا کرنا ہے۔

زکوٰۃ سے وابستہ کئی اور معاشرتی پہلو ہیں جن کے بارے میں قرآن اور سُنّت ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر مسلم برادری اور مسلم حکومت کی تشکیل میں زکوٰۃ کا اہم کردار ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ؕ وَ لِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ۔

"یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے منع کریں گے۔ اور تمام معاملات کا انجامِ کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔" (الحج:41)

وہ لوگ جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، نہ صرف اپنا ہی نقصان کرتے ہیں بلکہ پوری مسلم امت کیلئے نقصان کا سبب بنتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے،

Marfat.com

ولم يمنعوا زكاة أموالهم إلا منعوا القطر من السماء ولولا البهائم لم يمطروا۔

"ایسے لوگ اپنے اموال پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتے سوائے اسکے کہ ان پر آسمان سے بارش کا نزول روک دیا جاتا ہے، اگر جانوروں کا معاملہ نہ ہوتا تو شاید بارش مکمل طور پر روک لی جاتی۔"[1]

اللہ اور اُسکے رسول ﷺ نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ زکوٰۃ کا ادا نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے۔ درحقیقت اللہ تعالیٰ ایسے مسلمانوں کو کڑے عذاب سے ڈراتا ہے۔ مثال کے طور پر ایسے افراد کے سلسلے میں جو اپنے مالوں پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، قرآن کی مندرجہ ذیل آیت ملاحظہ کیجیے،

وَ لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ؕ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ وَ لِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ

"جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بُری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔" (آلِ عمران:180)

رسول اللہ ﷺ نے اس سزا کی تفصیل ایک حدیث میں بیان فرمائی جو کہ ان لوگوں کا مُقدّر بنے گی جو اپنے مالوں پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ صحیح البخاری میں ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا،

---

[1] اسے ابنِ ماجہ نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ مستند ہے۔ دیکھیں محمد ناصر الدین الالبانی، سلسلۃ الحدیث الصحیحہ (بیروت: المکتب الاسلامی، 1979)، جلد 1، حدیث نمبر 106۔

Marfat.com

تاتي الإبل على صاحبها على خير ماكانت إذا هو لم يعط فيها حقها تطؤه بأخفافها وتأتي الغنم على صاحبها على خيرماكانت إذا لم يعط فيها حقها تطؤه بأظللافها وتنطحه بقرونها۔۔۔ولا يأتي أحدكم يوم القيامة بشاة يحملها على رقبته لها يعار فيقول يا محمد فأقول لا أملک لک شيئا قد بلغت ولا يأتي ببعير يحمله عى رقبته له رغاء فيقول يا محمد فأقول لا أملک لک من الله شيئا قد بلغت۔

"[روزِ قیامت] اونٹ اپنے مالک کے پاس ایسی صحت مند حالت میں آئے گا جیسی اس نے [دنیا میں] کبھی نہیں دیکھی ہوگی، اور اگر انہوں نے اسکی زکوٰۃ نہ دی ہوگی تو وہ انہیں اپنے پیروں تلے روندے گا؛ اسی طرح، دُنبہ ایسی صحت مند حالت میں آئے گا جو اس کے مالکوں نے دنیا میں کبھی نہ دیکھی ہوگی۔ اور اگر انہوں نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی ہوگی تو وہ انہیں اپنے کھروں سے روندے گا اور اپنے سینگ چبھوئے گا۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میں سے کوئی قیامت کے روز میرے پاس اس حالت میں آئے کہ اسکا دُنبہ اسکی گردن پر چڑھا ہوا اسے زدوکوب کر رہا ہو۔ اور پھر وہ کہے [اے محمد مہربانی فرما کر میری شفاعت کیجیے]، میں کہوں گا میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا، اسی طرح میں یہ نہیں چاہتا کہ تم میں سے کوئی اس حالت میں میرے پاس آئے کہ اسکی گردن پر ایک اونٹ سوار ہو جو غرّا رہا ہو، ایسا شخص کہے گا اے محمد [میری شفاعت کیجیے]، میں اس سے کہوں گا میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا کیونکہ میں نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچا دیا تھا۔"

رسول اللہ ﷺ نے زکوٰۃ ادا نہ کرنے کے نتائج سے آگاہ کر دیا۔ اس سلسلے میں البخاری کی مندرجہ ذیل حدیث بھی ملاحظہ کریں،

من آتاه الله ما لا فلم يؤد زكاته مثل له ماله يوم القيامة شجاعا أقرع له زبيبتان يطوقه يوم القيامة ثم يأخذ بلهزمتيه يعني بشدقيه ثم يقول أنا مالک أنا كنزک۔

"جس کو اللہ تعالیٰ نے مال عطا کیا اور وہ اپنے مال پر زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، پھر قیامت کے روز اس کی دولت ایک گنجے سر زہریلے سانپ کی شکل میں اپنے دو زہریلے ڈنک لیے اسکی گردن

Marfat.com

کے گرد لپٹی ہو گی جو اس کے گالوں کو ڈسے گی اور کہے گی' میں تمہاری دولت ہوں، میں تمہارا خزانہ ہوں۔' "

یہ کہنے کے بعد آپ ﷺ نے سورۃ آلِ عمران کی اس آیت کی تلاوت فرمائی جس کا ذکر اوپر گزرا ہے۔ قرآن کی ایک اور آیت جس میں ایسے افراد کا ذکر ہے جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۔ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ ۭ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ۔

"دردناک سزا کی خوشخبری دو اُن کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنّم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، لو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔"(التوبہ:34-35)

اس کے بارے میں حکم جو زکوٰۃ ادا نہیں کرتا

جیسے کہ زیرِ مطالعہ حدیث میں صاف طور پر بیان ہوا ہے، زکوٰۃ اسلام کا ایک اہم رکن ہے۔ اگر کوئی شخص اس کی فرضیت کا انکار کر دے یا کہے کہ یہ اسلام کا حصہ نہیں تو ایسے شخص کے بارے میں علما کا اتّفاق ہے کہ وہ کافر ہے۔[1]

ایک بار پھر سوال یہی ہے کہ اگر کوئی شخص زکوٰۃ کی فرضیت کا تو منکر نہیں لیکن اپنی سُستی، بخل یا غفلت کی وجہ سے زکوٰۃ ادا نہیں کرتا، تو ایسے شخص کا کیا مقام ہے؟ کیا وہ

---

[1] ظاہر ہے کہ اس میں ایسے نو مسلم کو استثنا حاصل ہو گا جسے زکوٰۃ کے بارے میں معلومات نہیں۔

Marfat.com

مسلمان رہتا ہے؟ جمہورِ علما کی رائے میں ایسا شخص مسلمان رہتا ہے۔[1] اس سے حُکّام بزورِ زکوٰۃ وصول کرینگے اور اُسکی سزا کا قانونی تقاضوں کے مطابق فیصلہ کیا جائیگا۔[2] بہر حال صحابیٔ رسول ﷺ عبد اللہ ابنِ مسعودؓ سے ایسی اخبار ملتی ہیں جن کے مطابق زکوٰۃ ترک کرنے والے شخص کو وہ مسلمان نہیں سمجھتے۔ انہوں نے فرمایا، "وہ جس نے زکوٰۃ دینا ترک کر دیا وہ مسلمان نہیں۔" انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ "اگر کوئی شخص نماز قائم کرتا ہے لیکن زکوٰۃ نہیں دیتا در حقیقت اسکی کوئی نماز نہیں۔"[3]

ابنِ عثیمین نے لکھا کہ امام احمد ابنِ حنبل کا ایک قول ہے کہ وہ جو اپنے بخل کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں ادا کرتا اُسی طرح سے غیر مومن ہو جاتا ہے جیسے اپنی سُستی کے سبب نماز ادا نہ کرنے کے سبب کوئی غیر مومن ہو جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام کے کئی پیروانکے اس قول کے حامی ہیں۔[4]

اگر کوئی گروہ زکوٰۃ دینے سے انکار کرتا ہے تو ایسے گروہ کے خلاف جنگ کی جاسکتی ہے۔ اور ایسا ہی کچھ دورِ صحابہؓ میں ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد بعض قبائل اسلام سے

---

[1] احمد، مثال کے طور پر، اپنی تصنیف عقائد میں کہتے ہیں، "جو کوئی صلوٰۃ کو ترک کرتا ہے کفر کرتا ہے اور ایسا کوئی عمل نہیں جس کا ترک کرنا کفر ہو سوائے نماز کے۔ جو کوئی اسے ترک کرتا ہے کافر ہو جاتا ہے۔۔۔۔" حوالہ در الالکائی، جلد 1، ص۔159۔

[2] سنن ابو داؤد کی ایک حدیث میں آتا ہے، "وہ جو اجر حاصل کرنے کی نیت سے زکوٰۃ دے گا اسے اسکا اجر ملے گا۔ اگر کوئی زکوٰۃ سے پہلو تہی کرتا ہے، ہم اس کی آدھی املاک ضبط کر لیں گے جو اس پر واجب الادا ہے ہمارے ربِّ عظیم کے واجب الادا (مال) میں سے۔" الالبانی کے مطابق، یہ ایک حسن حدیث ہے [محمد ناصر الدین الالبانی، صحیح السُنن ابی داؤد (ریاض: مکتبہ التربیۃ العربیہ لی دوال الخلیج، 1991)، جلد 1، ص۔296]۔ یہ احمد ابنِ حنبل کا نظریہ معلوم ہوتا ہے۔ تاہم، احمد حسن نے لکھا، "لیکن یہ فرمان اسلام کے ابتدائی دور میں لاگو ہوتا تھا۔ بعد ازاں اسے منسوخ کر دیا گیا۔" (احمد حسن، ترجمہ، سنن ابو داؤد (لاہور: شیخ محمد اشرف، 1084)، جلد 2، ص۔412۔ واللہُ اعلم بالصواب۔

[3] ان حوالوں کو دیکھا جاسکتا ہے ابنِ بطوطہ، جلد 2، ص۔ 681۔ ابن ابو شیبہ، المصنف، جلد 3، ص ص۔9-7۔ الحیتمی کے مطابق، یہ روایات مستند ہیں ابنِ مسعودؓ سے۔ جیسا کہ، احمد ابنِ حجر الحیتمی، الزواجر اختلاف الکبائر (بیروت: دار المعارفہ، 1987)، جلد 1، ص۔170۔

[4] محمد ابنِ عثیمین، الشرح الممتع علی زاد المستقنع (ریاض: مؤاسات عاصم، 1996)، جلد 6، ص۔7۔

Marfat.com

مُنحرف ہو گئے اور بعض نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ خلیفہ اول ابو بکر صدیق ؓ نے ان کے خلاف جنگ کی اور اعلان کیا "اللہ کی قسم، میں جنگ کرونگا ہر اس شخص سے جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کریگا۔ اموال پر زکوٰۃ ایک ایسا حق ہے جسکا وصول کرنا ضروری ہے، اللہ کی قسم! اگر وہ مجھے ایک بکری کے بچے کی زکوٰۃ بھی ادا کرنے سے انکار کرینگے جو وہ اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں ادا کرتے تھے تو میں ان سے جنگ کرونگا اس کی ادائیگی کیلئے۔"(مسلم)

کئی اعتبار سے اوپر بیان کیا گیا، واقعہ بہت اہم ہے۔ اس سے ان لوگوں کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے رویے کا اندازہ ہوتا ہے جن لوگوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا۔ صحابہؓ نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ آیا وہ اب بھی زکوٰۃ پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ صحابہؓ نے ان لوگوں کے خلاف اسی طرح جنگ کی جیسے کھلے بندوں اسلام کے مُرتدین کے خلاف کی۔ دوسرے الفاظ میں وہ ایسے لوگوں کو انکے عمل کی بنا پر دائرۂ اسلام سے خارج تصوّر کرتے تھے۔ [1]

"اللہ کے گھر کا حج کرنا"

حج کے معنی

حدیث کی اس روایت میں جس اگلے رُکنِ اسلام کا ذکر ہوا ہے وہ اللہ کے گھر یا کعبے کا حج ہے۔ لغوی اعتبار سے حج کے معنی ہیں، "اس نے آمد و رفت کر لی، اپنے آپ کو کسی کی طرف لے گیا، یا کسی شخص کی طرف، یا کسی چیز کی طرف جو قابلِ تعظیم ہو اور عزت و احترام کے لائق ہو۔" [2] شرعی اعتبار سے اس کے معنی سال کے ایک خاص وقت میں اللہ کی عبادت کی

[1] جیسا کہ، الحوالی، جلد2، ص ص۔ 652-650۔

[2] E.W.Lane, Arabic-English Lexicon (Cambridge, England: The Islamic Texts Society, 1984), vol 1,p.513.

Marfat.com

غرض سے ایک خاص جگہ پر پہنچنے کیلئے سفر کرنا۔ دوسرے الفاظ میں یہ مکہ کا سفر ہے جو خاص مہینوں میں حج کی ادائیگی کیلئے کیا جاتا ہے جو کہ اللہ کی خاطر اس کی عبادت کا ایک عمل ہے۔

حج کی اہمیت

حج کا کرنا ہر اس مسلمان پر فرض ہے جس کے پاس اس کیلئے ذرائع موجود ہوں حج کی فرضیت کے واضح ثبوت قرآن اور سُنّت میں موجود ہیں۔ لیکن اس کی اہمیت صرف ایک فرض ہونے سے بہت زیادہ ہے۔ یہ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ حج ادا کرنے کا اجر بہت زیادہ ہے آپ ﷺ نے فرمایا،

من حج لله فلم يرفث ولم يفسق رجع كيوم ولدته أمه۔

"جو کوئی اللہ کی خاطر حج کرتا ہے اور نہ کوئی شہوت کرتا ہے نہ گناہ کے کام کرتا ہے تو وہ اسطرح واپس آتا ہے جیسا وہ اس دن تھا جبکہ اسکی ماں نے اسے جنم دیا۔" یعنی گناہوں سے پاک۔ (البخاری و مسلم)

رسول اللہ ﷺ کا یہ بھی قول ہے،

العمرة إلى العمرة كفارة لما بينهما والحج المبرور ليس له جزاء إلا الجنة۔

"ایک عمرے[1] سے دوسرا عمرہ ان دونوں کے درمیان کی خطاؤں کے لیے کفّارہ ہے، اور حج جو درست طریقے سے ادا ہوا اور اللہ کے ہاں مقبول ہوا اسکا اجر سوائے جنّت کے اور کیا ہے۔" (البخاری و مسلم)

ایک اور حدیث میں ہے،

---

[1] عمرے کو بعض اوقات "چھوٹا حج" بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں نسبتاً کم مناسک شامل ہیں اور اسے سال بھر کسی بھی موقع پر ادا کیا جاسکتا ہے۔

Marfat.com

أن رسول الله صلى الله عليه وسلم سئل أي العمل أفضل فقال إيمان بالله ورسوله قيل ثم ماذا قال الجهاد في سبيل الله قيل ثم ماذا قال حج مبرور۔

"رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا گیا 'کون سا عمل بہتر ہے' آپ ﷺ نے جواب دیا 'اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر ایمان لانا' پھر پوچھا گیا 'اسکے بعد' آپ ﷺ نے فرمایا 'اللہ کی راہ میں جہاد' پھر پوچھا گیا 'اسکے بعد' آپ ﷺ نے فرمایا 'وہ حج جو صحیح طور پر ادا کیا جائے اور اللہ کے ہاں مقبول ہو'۔" (البخاری، مسلم)

مزید یہ کہ خواتین اور ان لوگوں کیلئے جو جہاد کے متحمل نہیں ہوسکتے حج کرنے کا اجر جہاد کے برابر ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کیا جہاد خواتین پر فرض ہے تو آپ نے جواب دیا،

نعم عليهن جهاد لا قتال فيه الحج والعمرة۔

"ہاں، ان کیلئے وہ جہاد ہے جس میں جنگ وجدل نہیں، حج اور عمرہ۔"[1]

حج کے بے شمار فوائد ہیں ان کے علاوہ جن کا ذکر احادیث میں بیان ہوا۔ یہ بات نوٹ کرنے کے لائق ہے کہ اس میں تمام دنیا سے آئے ہوئے مسلمان ایک جگہ جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، یہ مختلف مقامات سے آئے ہوئے لوگوں کیلئے آپس میں ملنے کا بہترین موقع ہوتا ہے، اس سے آپس میں قربت بڑھتی ہے اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ مزید یہ کہ ان کے درمیان فرق باقی نہیں رہتا وہ سب ایک ہی طرح کے لباس پہنے ایک ہی طریقے پر اللہ کی عبادت کر رہے ہوتے ہیں۔ صدیقی حج کی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں،

---

[1] اسے احمد اور ابن ماجہ نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ صحیح ہے۔ محمد ناصر الدین الالبانی، عروۃ الخلیل فی تخریج احادیث منار السبیل (بیروت: المکتب الاسلامی، 1979)، جلد4، ص۔151۔

Marfat.com

صحیح کہا گیا کہ یہ[حج] ایمان کی تکمیل ہے کیونکہ یہ اپنے اندر دوسرے فرض اعمال کی خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ یہ نماز کی خصوصیت رکھتا ہے کیونکہ اسکے دوران کعبہ میں نماز ادا کی جاتی ہے جو کہ اللہ کا گھر ہے۔ اس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی ترغیب ہے جو کہ زکوٰۃ کا اہم وصف ہے۔ جب کوئی حج کا ارادہ کر کے اپنے گھر بار سے چولھا چکّی کو چھوڑ کر نکلتا ہے، اپنے عزیز و اقارب کو اپنے ربّ کی خوشنودی کی خاطر چھوڑ کر، وہ تنہائی اور سفر کی سختیاں جھیلتا ہے۔ یہ وہ تربیت ہے جو ہم روزے اور اعتکاف میں موجود پاتے ہیں۔[1] حج کے دوران ہمیں تربیت ملتی ہے مادّی آسائشوں سے، دنیاوی زندگی کے کروفر اور دکھاوے سے مکمل دوری کی۔ یہاں ایک شخص کو کبھی تو پتھریلی زمین پر سونا پڑتا ہے،[2] کعبہ کا طواف کرنا ہوتا ہے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا ہوتا ہے اور اپنے رات دن بس کپڑے کے دو اِن سلے ٹکڑوں کو پہن کر گزارنا ہوتے ہیں۔ اسکے لیے یہ ضروری ہے کہ تیل یا خوشبو کا استعمال نہ کرے۔ اسے اپنے بال مونڈھنے یا داڑھی ترشوانے کی بھی اجازت نہیں۔ مختصراً یہ کہ اسے حکم دیا جاتا کہ اللہ کی خاطر سب کچھ چھوڑ دے اور اپنے ربّ کے سامنے جھک جائے، جو کہ ہر مسلمان کی زندگی کا اصل مطمح نظر ہے۔ یہ طبعی حج درحقیقت اللہ کی طرف روحانی حج کا پیش خیمہ ہے، جب انسان دنیا کی ہر شے کو الوداع کر کے

---

[1] اعتکاف کے دوران ایک شخص اپنے آپ کو مسجد میں تخلیے کی حالت میں رکھتا ہے ذاتی عبادات کے لیے۔ عمومی طور پر رمضان کے آخر میں اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

[2] یہ لازمی نہیں لیکن یہ وہ طریقہ ہے جس پر حاجیوں کی اکثریت اپنی راتیں گزارتے ہیں {چند مخصوص راتوں میں جن میں منیٰ کا قیام اور مزدلفہ میں گزاری ہوئی رات شامل ہے۔}

Marfat.com

اپنے آپ کو اللہ کے حضور ایک عاجز بندے کی حیثیت میں پیش کرے گا اور کہہ رہا ہو گا 'حاضر ہے تیرے حضور تیرا بندہ میرے ربّ۔'[1]

{حج جسمانی اور ذہنی دونوں اعتبار سے جہاد کے لیے اپنے آپ کو تیار رکھنے کی تربیت ہے۔ جس میں جسمانی سختیاں جھیلنے اور مالی قربانی دینے کی ایک مشق ہوتی ہے (مترجم)}۔

حج اس پر فرض ہے جو اسکی استطاعت رکھتا ہے

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَ مَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔

"لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اِس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہو جانا چاہیے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔" (آلِ عمران:97)۔ اسی طرح سے حدیثِ جبریلؑ میں ایک سوال کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے واضح طور پر فرمایا حج فرض ہے ان پر جو اس کی استطاعت رکھتے ہیں۔

اس امر میں علما اختلاف کرتے ہیں کہ وہ کیا حالات ہیں جن میں یہ شرط لاگو ہو گی۔[2] عمومی طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ حج کا مقصد کسی انسان پر زیادہ بوجھ ڈالنا نہیں ہے۔ یہ ایک بہت بڑی عبادت ہے جسے ادا کرنے کی سنجیدگی سے کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہے جب ایسا کرنے کی ایک شخص میں استطاعت ہو، اس میں اسکا صحت مند ہونا، مالی طور پر اس کے قابل ہونا اور اسکے دوران اپنی ضروریات پوری کرنے کا متحمل ہونا شامل

---

[1] صدیقی، جلد2، ص۔577۔ وہ آخری فقرا جو انہوں نے بیان کیا اس سے قریب تر ہے جو حاجی حضرات دورانِ حج دہراتے رہتے ہیں۔

[2] مزید تفصیل دیکھی جا سکتی ہے، السیّد السابق، فقہ، جلد5، ص ص۔9-7۔

Marfat.com

ہے۔ بعض اصحابِ علم اس میں اس بات کو بھی شامل کرتے ہیں کہ سفر میں رہزنی اور دھوکہ دہی کا ڈر نہ ہو۔ ایک انسان زندگی کو خطرے میں نہ ڈال دے۔ مزید یہ کہ خواتین کیلئے ایک محرم (مرد محرم رشتے دار یا خاوند) کا ہمراہ ہونا ضروری ہے، کیونکہ خواتین کو تنہا سفر کی اجازت نہیں۔ بعض علما ان کو ایسے قافلے میں سفر کی اجازت دیتے ہیں جو "بااعتماد" افراد پر مشتمل ہو جس میں مرد اور خواتین شامل ہوں۔

اگر یہ شرائط پوری نہیں ہوتیں تو ایک شخص پر حج کا کرنا فرض نہیں ہوتا۔ اسے اس وقت کا انتظار کرنا چاہیے کہ جب اسے حج کرنے کی استطاعت حاصل ہو جائے۔ جب ایک شخص کے پاس حج کی استطاعت موجود ہو، اس امر میں اختلاف ہے کہ ایسے شخص کو کب حج ادا کرنا چاہیے، یعنی اختلاف اس بات پر ہے کہ کیا اسے فوراً حج ادا کرنا چاہیے یا وہ اگلے سال تک اسے مؤخّر کر سکتا ہے۔ اگلا موضوع اسی معاملے سے متعلّق ہے۔

حج کو مؤخّر کرنے کا مسئلہ

اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا حج کو مؤخّر کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ یوں تصوّر کیجیے کہ ایک شخص جس نے حج کا فریضہ ادا نہیں کیا اور اسکے پاس وہ اسباب اور صلاحیت موجود ہے کہ وہ موجودہ سال حج کر سکے۔ اگر وہ اپنے حج کو اگلے کسی سال تک مؤخّر کرتا ہے، کیا ایسا شخص گنہگار تصوّر کیا جائیگا یا نہیں؟ کیا ایسا کرنا اسکے لیے جائز تھا یا اُسے موقع ملتے ہی اس فریضے کو ادا کر دینا چاہیے تھا؟

امام مالک، امام ابو حنیفہ، امام ابنِ حنبل اور بعض شافعیہ کا یہ کہنا ہے کہ حج کی ادائیگی پہلا موقع ملتے ہی اس کا ادا کرنا ضروری ہے، ایسا نہ کرنے والا گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کیلئے مندرجہ ذیل دلائل موجود ہیں،

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے،

من كسر أو عرج فقد حل وعليه الحج من قابل۔

Marfat.com

71 حدیث نمبر3: "اسلام پانچ[ستونوں] پر تعمیر ہوا ہے"

"اگر کوئی شخص اپنی [ایک ہڈی] توڑ لیتا ہے یا لنگڑا ہو جاتا ہے تو وہ حالتِ احرام سے نکل جاتا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اگلے سال حج کرے۔"[1]

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ اگر اس بات کی اجازت ہوتی کہ ایک شخص جب چاہے حج ادا کرلے تو رسول اللہ ﷺ خصوصیت کے ساتھ یہ نہیں فرماتے کہ ایسا شخص اگلے سال ہی حج کرے۔

ایک اور حدیث میں ہے،

تعجلو إلى الحج يعني الفريضة فإن احد كم لا يدري مايعرض له۔

"حج کے ادا کرنے کیلئے جلدی کرو، جو کہ فریضہ ہے، کیونکہ تم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ اسکے ساتھ کیا ہو جائے۔"[2]

یہ روایت بھی موجود ہے کہ عمرؓ ابنِ الخطاب نے ایک بار یوں فرمایا کہ "میں خیال کرتا ہوں کہ کچھ لوگوں کو مختلف مقامات پر اسلیے بھیجوں کہ دیکھیں ایسے افراد کو کہ جن کے پاس حج کرنے کے اسباب موجود ہیں اور انہوں نے حج نہیں کیا، پھر ان پر جزیہ[3] لاگو کروں، کیونکہ ایسے لوگ مسلمان نہیں ہیں، یہ مسلمان نہیں ہیں۔"[4]

دوسری جانب استطاعت موجود ہونے کے باوجود حج میں تاخیر کو جائز سمجھنے کیلئے سب سے مضبوط دلیل یہ ہے کہ، یہ ایک حقیقت ہے کہ حج 6 ہجری میں فرض ہوا اور رسول اللہ ﷺ نے خود حج کرنے کیلئے 10 ہجری تک توقف کیا۔ لیکن الشوکانی نے اس دلیل کا جواب مندرجہ ذیل الفاظ میں دیا:

---

[1] اسے احمد، ابوداؤد، النسائی وغیرہ نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ صحیح ہے۔ دیکھیں الالبانی، صحیح الجامی، جلد 2، ص۔112۔

[2] اسے احمد نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامی، جلد 1، ص۔569۔

[3] جزیہ ایک ایسا محصول ہے جو غیر مسلم شہری حکومت کو ادا کرتے ہیں اور انہیں فوجی خدمات سے استثنا حاصل رہتا ہے۔

[4] اس روایت کو سید سعید ابن منصور اور البیہقی نے محفوظ کیا۔ الحیتمی کے مطابق، یہ ایک مستند روایت ہے۔ الحیتمی، الزواجر، جلد 1، ص۔198۔

Marfat.com

[اولاً] اس بارے میں اختلاف ہے کہ حج کب فرض ہوا، ایک رائے یہ بھی ہے کہ حج 10 ہجری میں فرض ہوا۔ لہٰذا [رسول اللہ ﷺ کے حج میں] کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔ اگر یہ تسلیم بھی کرلیا جائے کہ حج 6 ہجری میں فرض ہو گیا تھا، رسول اللہ ﷺ کے حج میں تاخیر کرنے کی وجہ ان کا اس بات کو پسند نہ کرنا تھا کہ مشرکین کے ساتھ حج کریں کیونکہ جب مشرکین حج کرتے تو خانہ کعبہ کا طواف برہنہ حالت میں کرتے تھے۔ جب اللہ نے اس گھر کو ایسے لوگوں سے پاک کر دیا تب رسول اللہ ﷺ نے حج ادا کیا۔ لہٰذا انہوں نے کسی عذر کی بنا پر حج کو مؤخر کیا [اور ایسا کرنا جائز ہے]۔ اختلاف اس کے معاملے میں ہے جو حج کو بغیر کسی عذر کے مؤخر کرتا ہے۔[1]

ایسے شخص کے بارے میں حکم جس کی موت اس حالت میں ہوئی کہ اس نے حج ادا نہیں کیا، اسکے باوجود کہ وہ اسکی استطاعت رکھتا تھا

وہ جس نے حج کی فرضیت سے انکار کیا وہ کافر ہے۔ وہ جس نے حج کی ادائیگی کی استطاعت ہونے کے باوجود اسے مؤخّر کیا اُس وقت تک کہ اسکی موت واقع ہو گئی، ایک فاسق یا گنہگار ہے۔ اس نے اپنے آپ کو آخرت میں اللہ کی ناراضگی اور سزا کا مستحق بنالیا۔

---

[1] محمد ابن علی الشوکانی، نیل الاوطار (ریاض: دارزمام، 1993)، جلد 4، ص ص۔ 338-337۔ ابنِ عثیمین لکھتے ہیں کہ حج کی فرضیت 9 ہجری میں ہوئی اور مدینے میں وفود کی آمد ورفت کی بنا پر رسول اللہ ﷺ اس سال حج نہ کر سکے۔ دیکھیں ابنِ عثیمین الشرح الممتع، جلد 7، ص ص۔ 18-17۔

Marfat.com

"ماہِ رمضان کے روزے رکھنا"

روزے کے معنی

لغوی اعتبار سے روزہ اپنے آپ کو کسی چیز سے روکنے کا، نیکی کا اور اللہ کے تقویٰ کا ذریعہ ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ سے پہلے آنے والے انبیا پر بھی فرض کیا گیا۔ قرآن کی وہ آیت جس میں رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم ہے وہیں اللہ تعالیٰ نے اسکی غرض وغایت بھی بیان فرمادی،

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم پر روزے فرض کر دیے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کیے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو گی۔" (البقرہ:183)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ روزہ جہنّم کی آگ سے بچاتا ہے،

الصيام جنة من النار كجنة أحد كم من القتال۔

"روزہ جہنّم کی آگ سے بچنے کیلئے ایک ڈھال ہے جیسے تمہاری ڈھال تمہیں جنگ کے دوران محفوظ رکھتی ہے۔"[1] مزید یہ کہ روزہ روزِ جزا کو ایک شفاعت کرنے والا بن کر آئے گا۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں،

الصيام والقرآن يشفعان للعبد يوم القيامة يقول الصيام أي رب منعته الطعام والشهوات بالنهار فشفعني فيه ويقول القرآن منعته النوم بالليل فشفعني فيه قال فيشفعان۔

[1] اسے احمد، النسائی وغیرہ نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامی، جلد2، ص۔720۔

Marfat.com

"روزہ اور قرآن قیامت کے روز شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا، 'اے ربّ، میں نے دن کے اوقات میں اسے اسکے کھانے پینے اور شہوت سے روکے رکھا، تو مجھے اسکی شفاعت کرنے دے۔' قرآن کہے گا، 'میں نے اسے رات میں سونے سے روکے رکھا، تو مجھے اسکی شفاعت کرنے دے۔' پھر انہیں اسکی شفاعت کی اجازت دی جائیگی۔"[1]

یہ ایک ایسا عمل ہے جو اللہ کیلئے ایک انسان کے اخلاص کا مظہر ہے۔ صرف اللہ ہی یہ جانتا ہے کہ اس شخص نے واقعی روزہ رکھا یا نہیں، کسی کو خبر ہوئے بغیر وہ چھپ کر روزہ توڑ سکتا ہے، اس لیے اللہ کے پاس روزہ دار کیلئے خاص اجر ہے، جس کا ذکر درجِ ذیل حدیثِ قدسی میں یوں ہوتا ہے،

يترک طعامه وشرابه وشهوته من أجلي الصيام لي وأنا أجزي به والحسنة بعشر أمثالها۔

"اللہ نے کہا، 'اس نے میرے لیے اپنا کھانا چھوڑا، اپنا پینا چھوڑا اور اپنی شہوات کو چھوڑا روزہ رکھا میرے لیے اور میں اسکا اجر دونگا۔ اور ہر نیکی کا اجر دس گنا دیا جائیگا۔" (البخاری)

جو شخص رمضان کے روزے اللہ پر ایمان اور اس پر اُمید کے ساتھ رکھے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اسکے تمام گزشتہ گناہ معاف فرمادے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،

من صام رمضان إيمانا واحتسابا غفرله ماتقدم من ذنبه۔

"جو کوئی ایمان اور اللہ سے اجر کی اُمید کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے گا اسکے سارے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائینگے۔" (البخاری و مسلم)

ابن القیم نے روزے کے بعض مُفید اور اہم پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے یوں لکھا،

روزے کا مقصد یہ ہے کہ اسکے ذریعے سے انسان کی روح خواہشات کے پنجوں سے نجات پاکر میانہ روی سے اپنی ذاتِ نفس کو آراستہ کرے، اور اسکے ذریعہ وہ پاکیزگی حاصل کرنے کے ہدف کا شعور حاصل کرے اور ہمیشہ کی آسودگی

---

[1] اسے احمد نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامی، جلد2، ص۔720۔

Marfat.com

حاصل کرے۔ اس میں خواہشات اور شہوات کی شدّت کو حدود میں رکھنا مقصود ہوتا ہے جسے بھوک اور پیاس سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس میں یہ احساس پیدا کرنا بھی شامل ہے کہ اس دنیا میں کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو قلیل مقدار میں بھی کھانا میسّر نہیں، اس سے شیطان کیلئے ایسے شخص کو فریب دینا مشکل ہو جاتا ہے، اس سے وہ اپنے اعضا کو ان چیزوں کی طرف رُخ کرنے سے روکتا ہے جن میں دو جہانوں کا نقصان مُضمر ہے۔ اسطرح روزہ اللہ کا تقویٰ رکھنے والوں کا بچھونا ہے، مجاہدوں کی ڈھال ہے اور نیکوکار لوگوں کا نظم ہے۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی ایک حدیث ہے جس میں آپ ﷺ نے روزے کو بے عذر توڑنے والے کو اسکی سزا سے ڈرایا، آپ ﷺ فرماتے ہیں،

بينما أنا نائم أتاني رجلان فأخذا بضبعي فأتيا بي جبلا وعرا فقالا اصعد فقلت إني لا إطيقه فقال أنا سنسهله لک فصعدت حتى إذا كنت في سواء الجبل إذا بأصوات شديدة قلت ما هذه الأصوات قالوا هذا عواء أهل النار ثم انطلق بي فإذا أنا بقوم معلقين بعر اقيبهم مشققة أشدا قهم تسيل أشداقهم دما قال قلت من هؤلاء قال الذين يفطرون قبل تحلة صومهم۔

"جبکہ میں سو رہا تھا، دو اشخاص آئے اور مجھے بازوؤں سے تھام لیا، وہ مجھے ایک عمودی ڈھلوان والی پہاڑی پر لائے اور کہا، 'چڑھو[اس پر]'۔ میں نے کہا، ' میں یہ نہیں کر سکتا۔' انہوں نے کہا 'ہم تمھارے لیے اسے آسان کر دینگے' لہٰذا میں نے چڑھنا شروع کیا یہاں تک کہ میں پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ گیا جہاں پر میں نے شدید رونا دھونا سنا۔ میں نے پوچھا۔ 'یہ کیسا رونا ہے۔' انہوں نے جواب دیا، ' یہ اہل نار کا واویلہ ہے۔' اسکے بعد وہ مجھے اور آگے لے گئے جہاں پر میں نے ایسے لوگ دیکھے جو اُلٹے لٹکے ہوئے تھے، ان کے جبڑے پھٹے ہوئے تھے اور ان سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے کہا، ' یہ کون لوگ ہیں؟' اس نے کہا، ' یہ وہ لوگ

---

[1] حوالہ درندوی، ص۔173۔

Marfat.com

ہیں جنہوں نے اپنے روزے وقت سے پہلے کھول لیے (پورے نہ کیے) وقت سے پہلے اس کے کھولنے کی اجازت نہ تھی۔''[1]

اس کے بارے میں حکم جو روزے نہیں رکھتا

اگر ایک شخص روزے کی فرضیت کا انکار کرتا ہے تو وہ کافر ہے۔ روزے کا فرض ہونا قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی بیشمار احادیث سے ثابت ہے۔ ایسے فرد کے بارے میں جو روزے کی فرضیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن روزہ رکھتا نہیں ایک حدیث میں یوں بیان ہوا ہے،

عرى الإسلام وقواعد الدين ثلاثة عليهن أسس الإسلام من ترک واحدة منهن فهو بها كافر حلال الدم شهادة أن لا إله إلا الله والصلاة المكتوبة وصوم رمضان۔

''اسلام کا خاصہ اور وہ اساس جن پر اسلام قائم ہے تین ہیں۔ جو کوئی ان میں سے کسی ایک کو بھی چھوڑ دیتا ہے کافر ہو جاتا ہے اس کا خون بہانا جائز ہو گیا۔ [وہ اعمال ہیں] ۔ شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، فرض نماز اور رمضان کے روزے۔'' اس حدیث کو ابو یعلیٰ اور الدیلمی نے بیان کیا۔ بعض علما اسے حسن کہتے ہیں۔ لیکن درست رائے وہ معلوم ہوتی ہے جو الالبانی کی ہے کہ یہ حدیث ضعیف (کمزور) ہے۔ مگر قوی امکان یہ ہے کہ یہ قول صحابیٔ رسول ﷺ ابنِ عباسؓ کا ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کا۔[2] لہٰذا اسے اس معاملے میں ایک قطعی ثبوت کے درجے میں نہیں لیا جا سکتا، خاص طور سے اس صورت میں کہ اس بات کی کوئی خبر موجود نہیں کہ ان کی اس رائے سے دیگر صحابہؓ نے اتّفاق کیا ہو۔

اس کے باوجود کہ کسی صحابیٔ رسول کا اس نتیجے پر پہنچ جانا اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ روزے کی کتنی اہمیت ہے۔ کوئی صاحبِ علم ایسے قول کا متحمل نہیں ہو سکتا، کجا یہ کہ ایک

---

[1] اسے ابنِ حبّان اور ابنِ خُزیمہ نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق، یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الترغیب والترہیب، جلد 1، ص۔420۔

[2] دیکھیں محمد ناصر الدین الالبانی، سلسلۃ الحدیث الضعیفۃ (بیروت: المکتب الاسلامی، 1398 ہجری)، جلد 1، ص ص۔132-131۔

Marfat.com

صحابیٔ رسول ﷺ سے اس کی توقّع کی جائے دراں حالیکہ کسی عمل کی واقعتاً اسلام میں اس قدر اہمیت ہو۔ یہ ٹھیک ہے کہ جمہور کی مضبوط ترین رائے کے مطابق ایسا شخص کافر نہیں ہو جاتا ایسے لوگ جو[بلاعذر]رمضان کے روزے نہیں رکھتے انہیں ابنِ عباسؓ کے قول پر غور کرنا چاہیے، کیونکہ یہ امکان موجود ہے کہ یہ قول صحیح ہو۔ اس پر الضہبی مزید یہ بیان کرتے ہیں،

ایسے افراد جن کو مومن مانا جاتا ہے۔ یہ رائے رکھتے ہیں کہ رمضان کے روزے چھوڑنے والا اس حالت میں کہ وہ بیمار بھی نہ ہو ایک زانی اور ایک شرابی سے بدتر ہے۔ درحقیقت یہ لوگ ایسے شخص کے اسلام کو مشکوک سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ایسا شخص زندیق (اسلام سے فرار ہوا) ہے۔ اور ان میں سے ہے جو اسلام کو برباد کرتے ہیں۔[1]

جہاد کیا ہے

اس حدیث کی دوسری روایت کے مطابق جو کہ مسند احمد میں موجود ہے، راوی ابنِ عمرؓ نے جب ان ارکانِ اسلام کو بیان کیا تو ان سے جہاد کی بابت سوال کیا گیا۔ ابنِ عمرؓ نے جواب دیا، "جہاد بہت بہتر عمل ہے مگر یہ وہ کچھ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے ہم سے بیان فرمایا۔" اسلام میں جہاد کی اہمیت قرآن اور سُنّت سے صاف طور پر ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے ایک بار یوں فرمایا،

رأس الأمر الإسلام وعموده الصلاة وذروة سنامه الجهاد۔

"تمام معاملات کا سر اسلام ہے، اسکا ستون نماز اور اس کا بلند ترین حصہ جہاد ہے۔"[2]

---

[1] حوالہ در سابق، جلد3، ص۔111۔

[2] اسے الترمذی نے محفوظ کیا۔

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ نے بہر حال اس حدیث میں جہاں اسلام کے ارکان کا ذکر کیا جہاد کا ذکر نہیں کیا۔ آج کل ایسے لوگ ہیں جو جہاد پر بہت زور دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس موضوع پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی گئی جس کا عنوان ہے jihad-the sixth obligation(جہاد۔ چھٹا رُکن)۔ بد قسمتی سے ایسے کئی افراد اسلام کے ارکان کے بارے میں غفلت برتتے ہیں۔ ان کا معاملہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی اپنے گھر کی تیسری منزل کی آرائش میں مصروف ہو اور اس بات کی فکر نہ ہو کہ آیا اسکی بنیادیں بھی مضبوط ہیں یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب، لیکن شاید یہ ایک اہم وجہ ہو اس بات کے پیچھے کہ ایسے لوگ موجود ہیں جو جہاد کے بارے میں بہت بات کرتے ہیں اور جہاد میں حصہ بھی لیتے ہیں لیکن اپنی زندگیوں کو اسلام کے مطابق نہیں ڈھالا۔[1] ان میں سے بعض جھوٹ بولنے اور اپنے مسلمان بھائی کو دھوکا دینے سے بھی باز نہیں آتے۔ جہاد کے ختم ہو جانے کے بعد وہ صرف اپنے بہترین مفاد کی ہی فکر کرتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کی انہیں پروا نہیں ہوتی۔ یہ سب اسلام کے کسی ایک پہلو پر زور دینے، اس کے ارکان اور بنیادوں کو نظر انداز کرنے کے شاخسانے ہیں۔ ایسا نہیں کہا جاسکتا، کامیابی حاصل ہو سکتی ہے اگر کوئی بنیادی ڈھانچے کو چھوڑ کر {دیگر} نسبتاً کم اہم اُمور پر توجّہ مرکوز کرلے۔

مختلف اصحابِ علم نے جہاد کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس سوال پر بھی تبصرہ کیا ہے کہ جہاد کو اسلام کے بنیادی ارکان میں کیوں شامل نہیں کیا گیا۔ مثلاً، بعض کی رائے میں اسکی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث جہاد کی فرضیت سے پہلے کی ہے۔ لیکن یہ رائے وزن نہیں رکھتی، کیونکہ روزوں اور زکوٰۃ کی فرضیت کا ذکر اس حدیث میں آیا ہے۔ جبکہ جہاد ان سے پہلے فرض کیا گیا تھا۔

[1] جیسا کہ، ابن حجر، فتح، جلد ۱، ص۔73۔

Marfat.com

ابنِ رجب اور ابنِ حجر کے مطابق، رسول اللہ ﷺ نے جہاد کا ذکر اس بنا پر نہیں کیا کیونکہ جہاد عام طور پر ایک فرض ِ کفایہ [جو مجموعی طور پر ایک پورے گروہ، قصبہ یا قبیلے کے افراد پر فرض ہوتا ہے انفرادی طور پر نہیں] ہوتا ہے اور فرض ِ عین کی صورت نہیں۔[1] ابنِ رجب یہ بھی لکھتے ہیں کہ جہاد ایسا فرض نہیں جو روزِ قیامت تک فرض رہے گا۔ عیسیٰ علیہ اسلام کے دوبارہ اس دنیا میں آنے کے بعد صرف ایک ہی دین باقی رہے گا اور اسطرح جہاد ختم ہو جائیگا۔ جبکہ اسلام کے دوسرے ارکان مسلمانوں پر روزِ قیامت تک فرض رہیں گے۔[2]

{مُصنف نے ابنِ رجب اور ابنِ حجر کا حوالہ دیتے ہوئے عین ان کے الفاظ نہیں لکھے بلکہ ایک خلاصہ پیش کیا ہے۔ زیادہ مناسب یوں کہنا معلوم ہوتا ہے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ جہاد ہمہ وقت تمام مسلمانوں کیلئے فرض عین کی صورت میں فرض نہ ہو۔ یوں بھی ممکن ہے کہ ایک خاص علاقے کے مسلمانوں پر یہ فرض عین ہو جبکہ دیگر کیلئے فرضِ کفایہ۔ (مترجم)}

واللہ اعلم بالصواب لیکن یہ دونوں ہی تعبیریں مطمئن نہیں کرتیں۔ جہاد اسلام کا نکتۂ عروج ہے لیکن اسکی بنیادوں میں سے یا اسکے سُتونوں میں سے نہیں۔ بنیاد یا ستون ہونا یہ ظاہر کرتا ہے کہ دیگر اعمال اس پر مُنحصر ہونگے۔ ایک شخص کا اسلام پر مجموعی طور پر عمل کرنا اس بات سے براہِ راست تعلّق رکھتا ہے کہ وہ شخص اسلام کے بنیادی ارکان کو کتنے بہتر انداز میں پورا کرتا ہے۔ اگر یہ بنیادی ارکان درست اور مناسب طریقے سے پورے کیے جائیں تو دیگر اعمال، جیسے کہ جہاد درست اور مناسب طور پر کیا جائیگا — اسکے بغیر دیگر اعمال صحیح مقصدیت کے ساتھ ادا نہیں ہونگے یا یہ کہ ان دیگر اعمال کی ادائیگی کے دوران درست راہ سے بھٹک جانے کے زیادہ امکانات ہوں گے۔ اس وجہ سے یہ اعمال اسلام کے ارکان ہیں جب کہ دیگر اعمال اس تعریف میں نہیں آتے۔

---

[1] جیسا کہ، ابنِ حجر، فتح جلد 1، ص۔ 73۔

[2] ابنِ رجب، جامی، جلد 1، ص۔ 152۔

Marfat.com

حدیث کا خلاصہ

- پانچ ارکان کو اسطرح سمجھا جاسکتا ہے: اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں پہلی قسم ان اعمال پر مشتمل ہیں جو کیے جائیں جبکہ دوسری قسم بعض اعمال سے اجتناب کرنا ہے۔ روزہ اس دوسری قسم سے ہے جبکہ دیگر ارکان کا تعلّق پہلی قسم سے ہے۔ مزید یہ کہ عملِ عبادت میں زبان سے ادا کرنا (جیسے کلمۂ شہادت اور نماز کے دوران تلاوت)، بدنی اعمال (جیسے نماز)، ایسے اعمال جن کا تعلّق مال سے ہو (جیسے زکوٰۃ) اور ایسے اعمال جن میں بدنی اور مالی دونوں پہلو شامل ہوں (جیسے حج)۔[1]

- یہ حدیث بتاتی ہے کہ اسلام کی تشکیل کیسی ہے۔ یعنی وہ بنیادیں جن پر اسلام قائم ہوتا ہے۔ اگر یہ بنیادیں اور سُتون مضبوط ہیں تو انشاء اللہ ایک شخص کا ایمان اور دین بھی مستحکم، درست اور مضبوط ہونگے۔ لیکن اگر بنیادیں کمزور اور غیر مُستحکم ہیں، تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ آگے چل کر دیگر مسائل رونما ہوں۔ بلکہ یوں کہیے کہ ایک انسان کو یہی توقع رکھنی چاہیے کہ کچھ مسائل اور کمزوریاں ایمان اور اللہ کے احکام کی پابندی کے سلسلے میں سامنے آئیں گی۔
- اگر کوئی شخص اسلام کے ارکان کی فرضیت سے انکار کرتا ہے تو وہ کافر ہو جاتا ہے۔ یہ ارکان واضح طور پر زیرِ نظر حدیث سے ثابت ہیں اور ان کا ثبوت قرآن کی کئی آیات اور کئی دوسری احادیث میں ملتا ہے۔
- اس بات پر اتّفاق ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے بیان کردہ اسلام کے رکن اولیٰ سے روگردانی کرتا ہے وہ اپنے اسلام کو ضائع کر کے کافر ہو جاتا ہے۔

---

[1] جیسا کہ، القاری، جلد 1، ص۔68۔

Marfat.com

- دوسرے رُکن کے بارے میں اختلاف ہے بہت سے اصحابِ علم نماز ترک کرنے والے کو بھی اسلام سے خارج تصوّر کرتے ہیں۔ اصحابِ علم کی ایک بڑی اکثریت اس رائے کی حامل ہے کہ ایسا شخص گناہگار ہے اور اپنے گناہ کی پاداش میں موت کی سزا کا مستحق ہے۔[1]
- زکوٰۃ، حج اور فرض روزوں کے بارے میں کم سے کم ایک صحابیؓ سے ایک قول ایسا روایت ہوا ہے کہ جو شخص قصداً ان ارکان کی ادائیگی نہیں کرتا تو وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ بہر حال جمہورِ علما کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس میں شک نہیں کہ ایسا کرنا سنگین گناہوں میں شامل ہے۔ لیکن ایک شخص اس کے سبب کافر نہیں ہو جاتا۔ ہر صورت میں صحابیٔ رسول ﷺ کے قول کو سنجیدگی سے لینا چاہیے اور ان ارکان کے چھوڑنے کو کوئی معمولی بات نہیں سمجھنا چاہیے۔

---

[1] اس طرح کی قانونی سزائیں۔ صرف حکّام کے ذریعے نافذ کی جاتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں، اسلامی حکومت کی حدود سے باہر، اس قسم کی سزائیں نافذ نہیں کی جاسکتیں۔ تاہم، اس سے ان جرائم کی سنگینی کم نہیں ہوتی اگر ایک شخص ان کا ارتکاب کرے۔

Marfat.com

فہرستِ مضامین

دیباچہ 87

حدیث نمبر4 89

رحمِ مادر میں تخلیق 89

منتخب عربی الفاظ اور معنی 90

اربعین کے متن میں ایک غلطی 92

تخریج 95

حدیث پر ایک جامع تبصرہ 96

راوی: عبد اللہ ابنِ مسعودؓ 96

رسول اللہ ﷺ نے ، اور وہ صادق و مصدوق ہیں ہم سے ارشاد فرمایا۔97

"یقیناً تم میں سے ہر ایک اکٹھا کیا جاتا ہے اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک، تب وہ وہاں پر ایک چپکی ہوئی چیز کی طرح ہوتا ہے اس عرصے میں اسکے بعد وہ ایک چبائے ہوئے لوتھڑے کی طرح ہوتا ہے اسی عرصے کے دوران۔" 100

تخلیق وافزائشِ انسان کے مراحل 100

"اکٹھا کیا جاتا ہے" 101

"اپنی ماں کے پیٹ میں" 103

"چالیس دن تک" 104

Marfat.com

"پھر وہ اس عرصے کے دوران ہی ایک چپکی ہوئی چیز(علقہ) ہوتا ہے"
107 .....

"پھر وہ اس عرصے کے دوران ہی ایک چبائے ہوئے لوتھڑے کی طرح
ہوتا ہے" 109

"اس کے بعد اسکے پاس فرشتہ بھیجا جاتا ہے۔" 110

"پھر وہ اس کے اندر روح پھونکتا ہے" 111

"اُسے یہ بھی حکم ہوتا ہے کہ چار معاملات کے متعلّق فیصلہ سُنادے:
اس کا رزق ، اس کی زندگی کی طوالت، اسکے اعمال اور [کیا وہ] غمگین
ہوگا[جہنّم میں داخل ہوکر] یا خوش ہوگا [جنّت میں داخل ہوکر]" 126

اُن کا مسئلہ جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ تمام سلسلہ120دنوں پر مُحیط
ہوتا ہے۔ 130

"میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی خدا نہیں، یقیناً، تم میں سے
کوئی ضرور اہلِ جنّت والے اعمال کرے گا اس وقت تک کہ اسکے اور جنّت کے
درمیان ایک ہاتھ کا ہی فاصلہ رہ جائے گا اور پھر جو کچھ اُسکے لیے لکھا جاچکا ہے
اپنا کام دکھائے گا اور وہ کوئی ایسے کام کرے گا جو اہلِ نار کے کام ہوتے ہیں
اور جہنّم میں داخل ہوجائے گا....." 134

حدیث کے اس حصہ کے متعلّق تنازعہ 134

"میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں جس کے سواکوئی ربّ /الٰہ نہیں".... 135

"یقیناً، تم میں سے کوئی ضرور اہلِ جنّت کے اعمال کرئے گا اس وقت
تک کہ اسکے اور جنّت کے درمیان ایک ہاتھ کا ہی فاصلہ رہ جائے گا پھر جو

Marfat.com

کچھ اسکے لیے لکھا جاچکا ہے اپنا کام دکھائے گا اور وہ کوئی ایسے کام کرے گا جو اہلِ نار کے کام ہوتے ہیں اور جہنّم میں داخل ہوجائیگا" 136

حدیث کے اس حصے کے بارے میں ایک غلط فہمی 139

"اور یقیناً، تم میں سے کوئی ضرور اہلِ نار کے اعمال کرے گا یہاں تک کہ اسکے اور جہنّم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جائے گا پھر جو کچھ اسکے لیے لکھ دیا گیا ہے، اپنا اثر دکھائے گا اور وہ اہلِ جنّت والے اعمال کرے گا اور اس میں داخل ہو گا۔" 141

چند متعلّقہ فقہی معاملات 142

اِسقاطِ حمل کا سوال 142

مردہ جنین کی نمازِ جنازہ 147

اس حدیث سے متعلّق دیگر چند نکات 149

حدیث کا خلاصہ 153

Marfat.com

دیباچہ

اربعین کی اس چوتھی حدیث میں تخلیقِ انسان کے ارتقائی مراحل کا بیان ہے۔ الٹرا ساؤنڈ (Ultra Sound) اور اس قسم کی دیگر سائنسی ایجادات نے جن تفصیلات سے حضرتِ انسان کو حالیہ دور ہی میں روشناس کروایا، آپ ﷺ کی اس حدیث میں 14 سو سال قبل ان تفصیلات کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ علمِ وحی کے ذریعے آپ ﷺ تک پہنچنے والی معلومات آج کے سائنسی نظریات کے مطابق ہیں۔ قرآنِ پاک میں بھی انسانی تخلیق کے ان مراحل کا بیان متعدد مقامات پر آیا ہے۔ قرآن و حدیث سے ملنے والی ان معلومات پر مسلم دنیا میں اور مغرب میں بھی تحقیق کی جاتی رہی ہے جس میں ان معلومات کا موازنہ دورِ حاضر کے سائنسی نظریات سے کیا گیا ہے اور ان دونوں قسم کی معلومات میں حیران کن مشابہت کو تسلیم کیا گیا ہے۔ کینیڈا کے ایک سائنسدان ڈاکٹر مور (Dr. Moore) کہتے ہیں، "اوّل تو میں ان معلومات کے درست اور معیاری ہونے پر حیران ہوا جو Embriology کی سائنس کے وجود میں آنے سے بہت پہلے ساتویں صدی عیسوی میں منظرِ عام پر آئیں۔ میں دسویں صدی کے مسلمان سائنسدانوں کی شاندار تاریخ سے تو واقف تھا جن کی شعبۂ طب میں بڑی خدمات ہیں، تاہم، مجھے قرآن و سنت میں موجود ان ایمانی حقائق کا علم نہ تھا"۔ وہ مزید کہتے ہیں، "مجھے یقین ہے کہ یہ معلومات محمد تک اللہ سے پہنچی ہیں۔ کیونکہ ان معلومات کا بیشتر حصہ وہ ہے جس تک ہماری رسائی کئی صدیوں بعد ممکن ہوئی ہے۔" یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ روزِ افزوں سائنس بدلتی رہتی ہے لیکن علمِ وحی جو کہ عین حق پر مبنی ہے اس میں تبدیلی نہیں آتی۔ زیرِ مطالعہ حدیث پر غور و فکر کے نتیجے میں ایک شخص کا وحی کی حقانیت پر یقین مستحکم ہوتا ہے۔

Marfat.com

اس حدیث میں بیان ہونے والا دوسرا اہم موضوع تقدیر سے متعلق ہے۔ یہ موضوع اکثر بحث و تمہید کا محور بنا رہتا ہے۔ یہ سوال اٹھایا جاتا ہے کہ جب سب کچھ پہلے سے متعین شدہ ہے تو پھر اس میں انسان کا کیا حصہ ہے؟ اور پھر جزا و سزا کے پورے نظام میں کیا حکمت ہے؟ ہمارے نزدیک اس معاملے کو آسان انداز سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ تقدیر کا علم انسان کے پاس نہیں، اللہ جس کا علم ہر چیز کو احاطہ کیے ہوئے ہے یہ جانتا ہے کہ انتخاب کی آزادی کے باوجود ایک انسان کس راہ کا انتخاب کریگا۔ مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ مکمل طور پر بااختیار ہے اور تقدیر کے لکھے کو بدل بھی سکتا ہے، اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق دعا، صدقہ اور دیگر نیک اعمال بُری تقدیر کو بہتر کر سکتے ہیں، جبکہ گناہ کے اعمال متعین شدہ معاملات مثلاً عمر، رزق وغیرہ میں کمی پیدا کر سکتے ہیں، واللہ واعلم بالصواب۔ حدیث کی تشریح میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث موجود ہے جو اس سلسلے میں موجود ابہام کو دور کرنے میں کارآمد ہو گی۔

اس حدیث میں انسانی جان کی حُرمت کا بھی تذکرہ ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے حدیث میں موجود ایک اضافی لفظ پر مفصّل بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ لفظ حدیث کا حصہ نہیں۔ مزید یہ کہ مصنف نے اس امر میں جمہور کی اس رائے سے مدِلّل اختلاف کیا ہے جس کے مطابق ماں کے پیٹ میں ارتقا پانے والا بچہ دراصل 120 دن گزر جانے پر ذی روح بنتا ہے۔ مصنف کے مطابق یہ عرصہ 120 دن نہیں بلکہ 40 دن ہے۔ ایسا تسلیم کر لینے کے کئی فقہی مضمرات ہیں۔ قارئین سے تشریح کے اس حصے پر خصوصی توجہ کی درخواست ہے، کیونکہ یہ معاملہ انسانی جان کا ہے، جس کی حُرمت اللہ تعالیٰ نے قائم کر دی ہے اور یہ بہت اہم معاملہ ہے۔

Marfat.com

حدیث نمبر4

رحمِ مادر میں تخلیق

عَنْ أَبِيْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: حَدَّثَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ الْمَصْدُوْقِ۔ إِنَّ أَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهُ فِيْ بَطْنِ أُمِّهِ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِثْلَ ذٰلِكَ ثُمَّ يُرْسَلُ إِلَيْهِ الْمَلَكُ فَيَنْفُخُ فِيْهِ الرُّوْحَ وَيُؤْمَرُ بِأَرْبَعِ كَلِمَاتٍ بِكَتْبِ رِزْقِهِ وَأَجَلِهِ وَعَمَلِهِ وَشَقِيٌّ أَوْسَعِيْدٌ فَوَ اللّٰهِ الَّذِيْ لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ إِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ حَتّٰى مَايَكُوْنَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ إِلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ فَيَدْ خُلُهَا وإِنَّ أَحَدَكُمْ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ النَّارِ حَتّٰى مَايَكُوْنَ بَيْنَهُ وَبَيْنَهَا إِلَّا ذِرَاعٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ أَهْلِ الْجَنَّةِ فَيَدْ خُلُهَا ـ رَوَاهُ الْبُخَارِيُّ وَمُسْلِمٌ۔

ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ ابنِ مسعودؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا، رسول اللہ ﷺ نے جو صادق اور مصدوق ہیں ہم سے ارشاد فرمایا: "یقیناً تم میں سے ہر کوئی اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک اکٹھا کیا جاتا ہے ایک مائع کی بوند کی صورت میں، اسکے بعد وہ چپکی ہوئی ایک چیز کی مانند (اسی عرصے میں) رہتا ہے، اسکے بعد وہ چبائے ہوئے ایک لوتھڑے کی شکل میں (اسی عرصے میں) رہتا ہے۔ اسکے بعد اس کے پاس وہ فرشتہ بھیجا جاتا ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔ اور اُسے حکم ہوتا ہے چار باتوں کے لکھ دینے کا: اسکا رزق، اسکا عرصہ حیات، اسکے اعمال اور [کیا وہ] غمگین ہوگا [جہنّم میں داخل ہو کر] یا خوش ہوگا [جنّت میں داخل ہو کر]۔ میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں، جس کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں، یقیناً تم میں سے کوئی اہلِ جنّت والے اعمال کرے گا اس وقت تک کہ اسکے اور جنّت کے درمیان ایک ہاتھ کا ہی

Marfat.com

فاصلہ رہ جائے گا اور پھر جو کچھ اسکے لیے لکھا جاچکا ہے اپنا کام دکھائے گا اور وہ کوئی ایسے کام کرے گا جو اہلِ نار کے کام ہوتے ہیں اور جہنّم میں داخل ہو جائے گا۔ اور یقیناً تم میں سے کوئی اہلِ نار والے اعمال کرے گا اس وقت تک کہ اس میں اور جہنّم میں صرف ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جائے گا۔ پھر جو کچھ اسکے لیے لکھا جاچکا ہے اپنا کام دکھائے گا اور وہ کچھ ایسے کام کرے گا جو اہلِ جنّت کے ہوتے ہیں اور جنّت میں داخل ہو جائیگا۔" (البخاری و مسلم)

منتخب عربی الفاظ اور معنی

الصَّادِقُ: "وہ سچا"۔

الْمَصْدُوْقِ: "وہ سچا مانا جانے والا"۔

إِنَّ: "یقیناً، دائماً"۔

يُجْمَعُ: "اکٹھا اور محفوظ کرنا"۔

خَلْقُهُ: "اسکی تخلیق، اسکا ہونا"؛ 'ہ' کا آخر میں موجود ہونا اسکے واحد مذکر ضمیر ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ "اسکا"۔

بَطْنِ: "پیٹ"۔

أُمِّهِ: "اسکی ماں"، ام ماں کو کہتے ہیں۔

أَرْبَعِيْنَ: "چالیس"۔

يَوْمًا: "دن"۔

نُطْفَةً: "مائع کی بوند"۔

ثُمَّ: "اسکے بعد"۔

يَكُوْنُ: "ہو گا"، "ہو جاتا ہے"۔

عَلَقَةً: "کوئی چیز جو چپک جائے"۔

Marfat.com

مِثْلَ: "اس طرح"۔

مُضْغَةً: "ایک چبایاہوالوتھڑا"۔

يُرْسَلُ: "بھیجا"۔

الْمَلَكُ: وہ "فرشتہ" یہاں اس فرشتے کے متعلق جس کے پاس ارحامِ مادر کی ذمہ داری ہے۔

الرُّوْحَ: "روح، زندگی کی پھونک"

كَلِمَاتٍ: "رسول اللہ ﷺ کے کلام میں عمومی طور پر اسکے معنی مکمل بیان یا مکمل جملوں کے ہیں، اسکا استعمال" معاملات کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔

رِزْقِهِ: "اسکارِزق، اسکی ضروریاتِ زندگی"۔

أَجَلِهِ: "عرصۂ حیات"۔

عَمَلِهِ: "اسکے اعمال"۔

شَقِيٌّ: "غمگین، بدبخت"۔

سَعِيْدٌ: "خوش، خوش بخت"۔

أَهْلِ: "بسنے والے، حامل، حدیث میں اہلِ جنت اور اہلِ نار، جنت اور جہنم میں بسنے والے"۔

الْجَنَّةِ: "وہ جنّت"۔

حَتَّى: "یہاں تک"۔

بَيْنَهُ: "اسکے اور کسی چیز کے درمیان"، 'ہ' واحد مذکّر کو ظاہر کرتا ہے۔

بَيْنَهَا: "اسکے اور کسی چیز کے درمیان" 'ھا' واحد مؤنّث کو ظاہر کرتا ہے، یہاں پر جنّت کیلئے استعمال کیا گیا ہے جو مؤنث ہے۔

Marfat.com

ذِرَاعٌ: ''ایک ہاتھ کا فاصلہ'' اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں ''بازو میں ہاتھ سے کہنی تک کا فاصلہ''۔

النَّارِ: ''وہ آگ''۔

اربعین کے متن میں ایک غلطی

حدیث کے متن میں یہ بات نوٹ کی جاسکتی ہے کہ اس میں آیا ہے ''یقیناً، تم میں سے ہر ایک چالیس دن تک اپنی ماں کے پیٹ میں جمع کیا جاتا ہے مائع کے ایک بوند (نطفہ) کی صورت میں۔'' یہ آخری لفظ نطفہ ایک غلطی ہے، اور یہ حدیث کے متن کا حصہ نہیں اس بارے میں القضاح کا بیان ہے،

لفظ نطفہ [غلطی سے] متن میں اضافہ ہے۔ اس کا ذکر سُنّت کے کسی بھی ذریعہ سے نہیں آیا، لیکن یہ لفظ بعد کے لکھنے والوں کی کتابوں میں ملتا ہے جیسے کہ النووی کی اربعین کی حدیث نمبر چار(4) میں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسکا استعمال جملے کو واضح کرنے کی غرض سے کیا گیا، لیکن بعد ازاں لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ حدیث کا حصہ ہے اور اسے اسی طرح شامل کر لیا۔ در حقیقت اس لفظ کی حدیث میں موجودگی بعض اعتبار سے حدیث کے معنوں میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ جبکہ حدیث کا اصل متن صاف طور پر بیان کرتا ہے کہ جنین(fetus) تینوں مرحلوں (نطفہ، علقہ اور مضغہ) سے چالیس دنوں میں گزرتا ہے۔ اضافی طور پر استعمال کیا گیا لفظ ایک الگ معنی دیتا ہے۔ غلط روایت کے مطابق یہ مرحلے پہلے چار مہینوں میں گزرتے ہیں۔ موجودہ دور کی سائنس

Marfat.com

نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ یہ درست نہیں۔ یہ حدیث ایسے کئی سائنسی معجزات میں سے ایک کا ذکر کرتی ہے جن کا ذکر مستند احادیث میں ملتا ہے۔[1]

یہ حیرت کی بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ اہلِ علم جنہوں نے النووی کی اربعین کی شرح لکھی اور اس پر حاشیے لکھے انہوں نے کبھی اس کی نشاندہی نہ کی کہ یہ لفظ غلط طور پر حدیث کے متن میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ ابنِ محمد جن کا سارا کام اربعین کی روایات ہی کی تحقیق پر مبنی ہے، وہ بھی اس نکتے کی نشاندہی نہ کر سکے۔ راقم نے ذاتی طور پر اس کے تمام حوالوں کو مختلف مقامات پر صحیح البخاری، صحیح مسلم، مسند احمد اور دیگر علم پاروں میں دیکھا جن کا ذکر شعیب الارناؤوط کے ان حاشیوں میں ہے جو انہوں نے ابنِ رجب کی جامع العلوم والحکم پر لکھے۔ ان میں نطفہ کا ذکر نہیں۔[2] بعض قارئین کیلئے یہ محض ایک نظر کی چوک (oversight) ہی ہو۔ لیکن وہ اشخاص جو حدیث کے کام سے واقف ہیں یہ جانتے ہیں کہ روایات میں اس سے بہت کم تر نوعیّت کے اختلافات کی حتّٰی کہ جن سے حدیث کے معنوں میں بھی کوئی فرق نہیں آتا، مسلسل نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ جبکہ مذکورہ معاملے میں حدیث کے معنوں میں بھی فرق آجاتا ہے۔ {یوں لگتا ہے کہ حدیث کے متن میں لفظ نطفہ کا اضافہ

[1] القضاح، ص ص۔25-26۔

[2] دیکھیں ارناؤوط اور باجس، زیریں حاشیے، ابنِ رجب، جامع، جلد 1، ص۔153۔ سلیم الھلالی، ایقاظ الھمم المستّٰی من جامع العلوم والحکم (دمام: دار ابن الجوزی، 1992)، ص۔83 نے بھی صرف البخاری اور مسلم کا حوالہ دیا ہے اور اس عدم موافقت کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اسی طرح الالبانی کی صحیح الجامع الصغیر (جلد 1، ص۔321) میں بھی غلط متن موجود ہے اور اس کے بارے میں کوئی نوٹ نہیں لکھا گیا۔ ابنِ حجر نے فتح الباری (جلد 13، ص۔313) میں بیان کیا ہے لفظ نطفہ صرف اس متن میں آیا ہے جسے ابو عیینہ نے وحب ابنِ جریر سے شعبہ کی سند پر روایت کیا ہے۔ غالب گمان یہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کسی راوی کی تشریح ہے جو اصل حدیث کا حصہ نہیں، جیسا کہ تمام مستند روایات سے واضح ہے۔ ضمناً یہ کہ صدیقی نے اس حدیث کا جو ترجمہ پیش کیا (جلد 4، ص۔1391) وہ حیران کُن ہے {عبدالحمید صدیقی کے کیے ہوئے صحیح مسلم کے جس انگریزی ترجمے کا حوالہ دیا گیا وہ حدیث نمبر 6390 ہے جبکہ ذرا آگے چل کر حدیث نمبر 6392 ہی میں اس ترجمے کے تصحیح ہو جاتی ہے، جبکہ یہ حدیث مصنف کے اس نکتۂ نظر کی تائید کرتی ہے کہ فرشتہ کے وارد ہونے سے قبل کے مراحل تقریباً 40 دنوں میں مکمل ہو جاتے ہیں (مترجم)} اور سب سے اہم یہ کہ، یہ صحیح مسلم کے کسی بھی نسخے سے مطابقت نہیں رکھتا جن کو مُصنّف نے دیکھا۔ واللہُ اعلم بالصواب۔

Marfat.com

ان آیاتِ قرآن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے کیا گیا ہو گا جن میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے اور جن کا حوالہ آگے دیا گیا ہے۔ تاہم، مصنف نے البر کے حوالے سے آگے اس امر کی وضاحت کی ہے کہ قرآن اور حدیث میں اس لفظ کا استعمال مختلف انداز سے کیا گیا ہے (مترجم)}

اس لفظ کے حذف کر دینے کے بعد حدیث کو اسطرح سمجھا جاسکتا ہے: ''یقیناً، تم میں سے ہر ایک جمع کیا جاتا ہے اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دنوں تک۔ اسکے بعد وہ ایک چپکی ہوئی چیز کی طرح ہوتا ہے اُسی عرصے میں اسکے بعد وہ ایک چبائے ہوئے لوتھڑے کی طرح ہوتا ہے اسی عرصے میں۔'' لہٰذا یہ سارے مراحل پہلے چالیس دنوں میں گزر جاتے ہیں۔ حدیث کو اس طرح سے سمجھنا نہ صرف آج جسے سائنسی حقیقت سمجھا جاتا ہے اس کے مطابق ہے ،بلکہ اس موضوع سے متعلق دیگر روایات کے مطابق بھی ہے۔[1]

علما اور مفسرینِ حدیث کی ایک بڑی تعداد نے اس حدیث کے معنوں کو یوں سمجھا ہے کہ یہ تین مراحل ایک سو بیس (120) دنوں پر محیط ہوتے ہیں۔ اس سے انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ روح کے پھونکنے کا عمل اس ایک سو بیس دن کے عرصے کے بعد ہوتا ہے۔ یہ نتیجہ کئی اور اہم فقہی نتائج کے اخذ کرنے کا پیش خیمہ بنتا ہے، جو آگے بیان کیے جائیں گے۔ یہاں سے آگے کی بحث میں جمہور کی رائے کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ لیکن اس کا ذکر آگے چل کر آئیگا۔ اس تفسیر کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ اسے اس موضوع پر موجود دیگر روایات کے مطابق کرنے میں کچھ قدرے مشکل دلائل کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ جیسا کہ آگے بیان کیا جائیگا۔

---

[1] نوٹ کریں کہ بعض ایسی روایات ہیں جن میں واضح طور پر بیان ہوا ہے کہ تین مراحل اور ان کے بعد کا مرحلہ ہر ایک 40 روز پر مشتمل ہوتا ہے۔ تاہم، کمزور روایات کو ثبوت کے طور پر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا، یہ غیر ضروری ہیں۔ اسے ایک اضافی ثبوت کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے القدیر کے نکالے ہوئے اس نتیجے کے خلاف کہ کمزور روایات کو ایک ممکنہ معنوں کے دوسرے پر ترجیح دینے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

Marfat.com

تخریج

اس حدیث کی وہ روایات جو عبد اللہ ابنِ مسعودؓ سے آئی ہیں ان کے الفاظ میں کچھ اختلاف ضرور موجود ہے لیکن ہر ایک روایت نطفہ کے لفظ کے بغیر ہے۔ ان میں البخاری جو اسے اپنی صحیح میں کئی مقامات پر استعمال کرتے ہیں، مسلم، احمد، ابوداؤد، الترمذی، ابنِ ماجہ کے علاوہ کئی اور شامل ہیں۔ اس حدیث کی معاون روایات میں انس ابنِ مالکؓ کی روایات (جو مسلم میں محفوظ ہیں)، جابرؓ کی روایت (جو احمد نے محفوظ کی)، ابنِ عمرؓ کی روایت (جو ابویعلیٰ نے محفوظ کی)، عائشہؓ کی روایت (جو البازار نے محفوظ کی) حذیفہ ابنِ اُسیدؓ کی روایت (جو مسلم نے محفوظ کی) شامل ہیں۔[1]

یہاں پر کی گئی تفسیر اس حدیث کے اُس مُستند متن کی بنیاد پر ہے جو صحیح البخاری میں موجود ہے۔ الفاظ کا فرق حدیث کے ابتدائی حصے میں ہے۔ البخاری کی روایت یوں ہے،

عن ابی عبد الرحمن عبد اللّٰہ ابن مسعود رضی اللّٰہ عنہ قال:حدثنا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو الصادق المصدوق قال ان احدکم یجمع خلقہ فی بطن امہ اربعین یوما ثم یکون فی ذلک علقۃ مثل ذلک ثم یکون فی ذلک مضغۃ مثل ذلک ثم یرسل الملک۔۔

ابو عبد الرحمٰن عبد اللہ ابنِ مسعودؓ سے روایت کیا گیا ہے کہ انہوں نے کہا۔ رسول اللہ ﷺ نے جو صادق اور مصدوق ہیں ہم سے ارشاد فرمایا: "یقیناً، تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کے پیٹ میں اکٹھا کیا جاتا ہے۔ چالیس دن تک، اسکے بعد وہ وہاں اس عرصہ میں ایک چپکی ہوئی چیز ہوتا ہے، اسکے بعد اسی عرصے کے دوران وہ ایک چبائے ہوئے لوتھڑے کی شکل میں رہتا ہے، اسکے بعد اسکے پاس وہ فرشتہ بھیجا جاتا ہے۔۔۔۔"

---

[1] دیکھیں ابنِ محمد، ص ص۔64-60۔

Marfat.com

حدیث پر ایک جامع تبصرہ

یہ ایک اہم اور بڑی معنی خیز حدیث ہے جس میں انسان کی تخلیق کے مراحل کا بیان ہے جس کی وضاحت آگے تشریح میں کی گئی ہے۔ ہمارے لیے اس میں انسان کی تخلیق سے وابستہ کئی اسباق موجود ہیں، دوسرا یہ کہ یہ حدیث تقدیر پر ایمان کی طرف اور اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اللہ کو پہلے ہی سے تمام ہونے والی باتوں کا علم ہے اور وہ جانتا ہے کہ کون اس دنیا میں کیا کچھ کرے گا۔

راوی: عبد اللہ ابنِ مسعودؓ

ابو عبد الرّحمٰن عبد اللہ ابنِ مسعودؓ (وفات 32 ہجری بمطابق 652 عیسوی) جو ابنِ اُمّ عبد کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں، ایک بہت غریب خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ آپؓ وہ چھٹے شخص ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا۔ انکی والدہ بھی شروع کے ایمان لانے والوں میں شامل ہیں۔ یہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مکّہ میں کھلے بندوں قرآن کی تلاوت کی۔ آپؓ نے پہلے حبشہ اور بعد میں مدینہ کو ہجرت فرمائی۔ آپؓ نے رسالت مآب ﷺ کے ساتھ تمام غزوات میں شرکت کی۔ آپؓ کو رسول اللہ ﷺ کے قریب رہنے کا موقع ملا اور اس وجہ سے وہ آپ ﷺ کے ذاتی اُمور کا علم بھی رکھتے تھے جن سے دوسرے لوگ ناواقف تھے۔ آپؓ نے تقریباً 60-سال کی عمر میں مدینہ میں رحلت فرمائی۔

آپؓ نے 848 احادیث روایت کیں لیکن شہرت قرآن فہمی کی نسبت سے زیادہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، "قرآن چار لوگوں سے لو: عبد اللہ (ابنِ مسعودؓ)، سالمؓ جو ابو حذیفہ کے موَکل ہیں۔ معاذ ابنِ جبلؓ اور اُبئ ابنِ کعبؓ۔" جب کبھی صرف عبد اللہ کہا جاتا ہے اس سے مراد عبد اللہ ابنِ مسعودؓ ہی ہوتے ہیں۔ آپؓ کو کوفہ میں ایک منصب پر

Marfat.com

فائز کیا گیا اور آپؓ نے وہاں کوفی مکتبِ فقہ کیلئے بنیادی کام کیے۔ جب آپؓ حدیث روایت کرتے تو رسول اللہ ﷺ کی حدیث میں کوئی غلطی ہو جانے کے خوف سے کانپ جاتے اور پسینے میں شرابور ہو جایا کرتے تھے۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے، اور وہ صادق و مصدوق ہیں ہم سے ارشاد فرمایا۔

الصادق وہ ہے جو اپنی ہر بات میں سچّا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کی یہ صفت آپ ﷺ پر پہلی وحی نازل ہونے سے قبل ہی معاشرے میں معروف تھی۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کفّارِ قریش جو آپ ﷺ پر ایمان لانے سے مسلسل انکار کرتے رہے اس بات کی توجیہہ پیش کرنے میں ناکام رہے کہ ایک شخص جو انسانوں کے معاملے میں غلط بیانی نہیں کرتا اللہ کے بارے میں ایسا کیونکر کر سکتا ہے یا یہ کہ وہ کیسے اللہ کی طرف سے وحی کے نُزول کے بارے میں غلط بیانی کر سکتا ہے۔

المصدوق یعنی ایسا شخص جس پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ بے شک جو کچھ وہ کہتے ہیں اور جو کچھ ان پر نازل ہوا ان ساری باتوں پر ایمان لایا جائیگا۔ کیونکہ اللہ جو کچھ ان پر نازل کرتا ہے اسے پورا بھی کرتا ہے۔ ابنِ مسعودؓ نے ان دونوں صفات کا ذکر تاکید کی غرض سے کیا، اور یوں بھی یہ بات واضح ہے کہ اس طرح کے استعمال میں پہلی صِفت براہِ راست دوسری صِفت سے مربوط ہوتی ہے۔

---

[1] قاری نے شاید یہ نوٹ کیا ہو گا کہ عبد اللہ ابنِ مسعودؓ ان چار عبد اللہؓ میں شامل نہیں جن کا ذکر عبد اللہ ابنِ عمرؓ کے بارے میں دی گئی معلومات کے ضمن میں کیا گیا۔ یہ اسلیے کہ عبد اللہ ابنِ مسعودؓ کی وفات دیگر چار کے مقابلے میں بہت پہلے ہو گئی تھی اور اس بنا پر وہ اس وقت سے پہلے رحلت فرما چکے تھے جب عبد اللہ نامی بعض صحابہ کے لیے یہ اصطلاح استعمال ہونا شروع ہوئی۔

Marfat.com

یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عبد اللہ ابنِ مسعودؓ نے کیوں اس حدیث کا آغاز رسول اللہ ﷺ کے اس تعارّف سے کیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اس حدیث میں کچھ ایسی معلومات اور چونکا دینے والے حقائق موجود ہیں، جو اس زمانے میں علمِ طب رکھنے کا دعویٰ کرنے والے لوگوں کیلئے شاید قابلِ قبول نہ ہوتے اور وہ ان سے اختلاف کرتے یا انکار کر دیتے، یہ وہ حقائق تھے جن کا علم اُس زمانے کے لوگوں کے پاس موجود نہ تھا، زیادہ سے زیادہ وہ لوگ اندازے اور قیاس کی پیروی کرتے تھے۔ لہٰذا مختصراً ابنِ مسعودؓ یہ کہہ رہے ہیں، "اس بات سے قطع نظر کہ یہ لوگ ان باتوں کو مانیں یا نہ مانیں جو رسول اللہ ﷺ نے بیان کیں، وہ صادق ہیں اور ان پر اعتماد کرنا لازمی ہے۔"[1]

بالخصوص یہ حدیث جنین کی تخلیق کے مختلف مراحل کا تذکرہ کرتی ہے۔ ارسطو کے دور سے یہ سوچ عام تھی کہ بالکل ابتدا ہی سے بچہ مکمل طور پر تشکیل پا جاتا ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رحمِ مادر میں بڑھتا جاتا ہے، یہ تخلیق کے مختلف مراحل والا نقطۂ نظر بہت جدید تصوّر ہے۔ البر لکھتے ہیں،

> ابتدائی انسانی جنین (embryo) کا مراحل میں تخلیق پانا، بہت سادہ سے بہت پیچیدہ تک، یہ انسانی علم کی نئی ارتقا ہے جسے سب سے پہلے ولف (Wolf) نے 1839 میں قلمبند کیا۔[2]

---

[1] ابنِ حجر اس تجزیے کو وزن نہیں دیتے۔ وہ کہتے ہیں کہ دیگر صحابہ سے ایسی احادیث آئی ہیں جن میں یہ انکشاف موجود نہیں اور وہ بھی اس حدیث کی ابتدا انہی کلمات سے کرتے ہیں۔ (دیکھیں ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص۔ 313)۔ یہ بات یقیناً درست ہے لیکن اس سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ ابنِ مسعودؓ نے تخصیص کے ساتھ اس حدیث کے شروع میں ان کلمات کو بیان کیا جبکہ دیگر احادیث کو بیان کرتے وقت انہوں نے یہ الفاظ استعمال نہیں کیے۔ حالانکہ یہ محض ایک قیاس ہے، یہ تشریح یہاں پر بہت مُناسب معلوم ہوتی ہے اور اسے مُسترد کرنے کے لیے کوئی مضبوط دلیل موجود نہیں۔ واللہُ اعلم بالصواب۔

[2] محمد علی البر، Human Development as Revealed in the Quran and Hadith (Jeddah, Saudi Publishing and Distributing House, 1989), P.12۔ اگر کوئی اس موضوع پر مزید معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے اس کے لیے اس مختصر مگر معلومات سے بھرپور کتاب میں بہت کچھ موجود ہے۔

Marfat.com

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حدیث کی ابتدا ان کلمات سے کرنا بہت مناسب بات ہے۔ تمام معاملات میں جامعیت کے ساتھ اس طرزِ عمل کو اپنانا ایک بہت اہم حیثیت رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس اللہ نے وحی بھیجی اور اُسی نے آپ ﷺ کو ہدایت فرمائی۔ لہٰذا، اس کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ ﷺ کی کسی بات پر شک کیا جائے، زیرِ بحث موضوع سے ہٹ کر بھی سوچیے کہ اللہ آپ ﷺ کو غلطیاں کرنے کیلئے اور لوگوں کو گمراہ کرنے کیلئے نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ اللہ کی اپنی ہتک بھی ہوگی۔ بدقسمتی سے آج کی سائنسی ترقی کی وجہ سے لوگوں میں یہ رُجحان پایا جاتا ہے کہ، وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ ایک سائنسی نظریے اور ایک ثابت شدہ حقیقت میں فرق ہوتا ہے۔ آج وہ بہت کچھ جسے لوگ مانتے اور تسلیم کرتے ہیں نظریات اور مفروضوں سے بڑھ کر کچھ نہیں جسے تیقُّن کے ساتھ ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ شاید سو سال کے اندر ہی ان نظریات کو کسی دوسرے زیادہ مضبوط نظریات کے وضع ہونے کی وجہ سے مُسترد کر دیا جائے۔ درحقیقت یہ سلسلہ روز بروز دنیائے سائنس میں رواں دواں ہے۔

اگر رسول اللہ ﷺ نے کچھ ارشاد فرمایا یا قرآنِ پاک کی کسی آیت میں کچھ بیان ہوا، تو وہ لازمی طور پر سچ ہے۔ اگر یہ کسی انسان کے تصوّرِ حقیقت سے اور "سائنسی معلومات" سے مُتصادم ہے تو ایسی صورت میں یا تو اس شخص سے حدیث کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے یا پھر اسکا تصوّرِ حقیقت ہی غلط ہے۔ کسی بھی صورت میں رسول اللہ ﷺ پر شک کرنے کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ آپ ﷺ جیسا کہ عبد اللہ ابنِ مسعودؓ نے فرمایا سچّے اور اعتماد کرنے کے لائق ہیں۔ اس دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں جو اُس سے مختلف ہو جیسا کہ اللہ نے وحی کے ذریعے بتادی۔ یہ اسلیے کہ یہ تخلیقات اور وحی دونوں ہی منجانب اللہ ہیں: اللہ جو کہ سب باتوں کا علم رکھنے والا اور اپنی بات میں انتہائی سچا ہے۔ لہٰذا، اس مادّی دنیا کے حقائق اور جو کچھ اللہ نے اپنے انبیا کی طرف وحی کیا ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

Marfat.com

"یقیناتم میں سے ہر ایک اکٹھا کیا جاتا ہے اپنی ماں
کے پیٹ میں چالیس دن تک [1]، تب وہ وہاں پر ایک
چپکی ہوئی چیز کی طرح ہوتا ہے اس عرصے میں اسکے
بعد وہ ایک چبائے ہوئے لوتھڑے کی طرح ہوتا
ہے اسی عرصے کے دوران۔"

تخلیق وافزائشِ انسان کے مراحل

رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث انسانی تخلیق کے مختلف مراحل کو بیان کرتی ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر نوٹ کیا گیا ہے، ان مختلف مراحل میں ہمارے لیے بہت سے اسباق ہیں۔ اللہ بہتر علم رکھنے والا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں مختلف مقامات پر اور رسول اللہ ﷺ نے متعدد احادیث میں ان مراحل کا ذکر کیا ہے۔ درحقیقت قرآنِ پاک میں ایک مقام پر سورۃ الحج میں، اللہ نے بچے کی تخلیق کے پہلے تین مراحل کا ذکر کیا جیسا کہ زیرِ نظر حدیث میں آیا ہے،

---

[1] {یہاں پر مصنف نطفہ کے لفظ کے ترجمے کو حذف کر دیتے ہیں کیونکہ ان کی رائے میں لفظ حدیث کے متن کا حصہ نہیں}

Marfat.com

يَاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ۔

"اے لوگو! اگر تمہیں زندگی بعد موت کے بارے میں کچھ شک ہے تو تمہیں معلوم ہو کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پھر نطفے سے، پھر خون کے لوتھڑے {زیادہ بہتر ترجمہ 'چپکی یا جُڑی ہوئی چیز' (مترجم)} سے، پھر گوشت کی بوٹی {زیادہ بہتر ترجمہ 'چبائے ہوئے لوتھڑے نما' (مترجم)} سے جو شکل والی بھی ہوتی ہے اور بے شکل بھی (یہ ہم اس لیے بتا رہے ہیں) تاکہ تم پر حقیقت واضح کریں۔" (الحج:5)

قرآنِ پاک میں ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے انسانی تخلیق کے سات (7) مختلف مراحل کو بیان کیا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا۔ پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی، پھر لوتھڑے {زیادہ بہتر ترجمہ 'چپکی یا جُڑی ہوئی چیز' (مترجم)} کو بوٹی {زیادہ بہتر ترجمہ 'چبائے ہوئے لوتھڑے نما' (مترجم)} بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔" (المومنون:14-12)

"اکٹھا کیا جاتا ہے"

مرد کا مواد عورت کے اندر داخل ہونے کے بعد اس بیضے سے ملتا ہے جو ماں کے رحم میں ہوتا ہے۔ القرطبی لکھتے ہیں کہ یہ شاید اس مواد کی طرف اشارہ ہے جو عورت کے جسم میں ایک قوت اور جوش کے ساتھ داخل ہوتا ہے اور اسکے بعد کچھ دور کا فاصلہ طے کر کے اس

Marfat.com

جگہ پر پہنچتا ہے جہاں پر بیضہ موجود ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ دونوں اس جگہ پر اکھٹے کیے جاتے ہیں ایک خاص وقت پر۔

اس حدیث پر تبصرہ کرنے والوں نے بیان کیا ہے کہ یہ بیان دونوں کے اکٹھا ہونے، ان کے تحفّظ اور ان کی بقا کو ظاہر کرتا ہے۔[1] یہ بھی اس حدیث سے واضح ہونے والا ایک اہم پہلو ہے۔

البر نے اس پورے عمل کو بیان کیا ہے جو مرد کے مادّۂ تولید کے عورت میں دخول کے بعد ہوتا ہے۔ کوئی یہ بات نوٹ کر سکتا ہے کہ دونوں، ایک بیضہ اور ایک منی کا جرثومہ (sperm) کس طرح اللہ کے اذن سے اکٹھے کیے جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کس طرح ان کی حفاظت اور رکھوالی کا کام مکمل کرتا ہے البر نے اس ضمن میں یوں لکھا:

> مرد کے مواد کا جرثومہ (sperm) اور بیضہ (ovum) دونوں .بیضی نالی (fallopian Tube) میں قیام پذیر ہوتے ہیں یعنی وہ افزائش کا ماحول پاتے ہیں۔ تقریباً 400 جرثومے ایک ساتھ بیضے تک پہنچتے ہیں۔ لیکن ان میں سے اللہ صرف ایک کو چُن کر اس کی نشوونما کا سامان کرتا ہے۔ ایک بار جب جرثومہ جاکر بیضے سے ملتا ہے اور مادۂ تولید خارج کرتا ہے جو اسکے سر (head) میں موجود ہوتا ہے۔ وہ بیضہ ایک دبیز دیوار سی قائم کر دیتا ہے جو کسی اور جرثومے کو اندر داخل نہیں ہونے دیتی۔ یہ واضح رہے کہ لاکھوں میں سے ایک جرثومہ یا شاید کروڑوں میں سے ایک جرثومہ بیضے کی بارآوری کیلئے منتخب کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے ہزاروں میں سے ایک بیضہ نشوونما کے لیے چُن لیا جاتا ہے۔ باقی ماہواری میں ضائع ہوتے رہتے ہیں۔[2]

---

[1] الحیتی، فتح، ص۔95۔

[2] البر، ص۔45۔

Marfat.com

"اپنی ماں کے پیٹ میں"

رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں (بطن) کا لفظ استعمال کیا۔ اس کے معنی پیٹ یا جسم کا وہ حصہ ہے جس میں معدہ ہوتا ہے۔ بے شک، یہ بات واضح ہے کہ جسم کا وہ حصہ جس میں جنین (fetus) رہتا ہے اُسے معدہ نہیں کہا جاتا، عربی زبان میں اس کے لیے جو لفظ استعمال ہوتا ہے وہ رحم ہے {اور اردو میں بھی یہی لفظ مستعمل ہے}۔ لیکن رحم جسم کے اس حصے میں ہوتا ہے جسے عمومی طور پر پیٹ کا حصہ کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ ایک ایسی مثال ہے جہاں پر کسی چیز کی طرف اشارہ ہے جبکہ مُراد صرف اس چیز کا ایک حصہ ہے، یعنی پیٹ کہا گیا ہے جبکہ رحم مُراد ہے۔ یہ عربی زبان کا ایک عام اُسلوب ہے۔ مزید یہ کہ اس حدیث کی دیگر روایات میں تخصیص کے ساتھ رحم کا لفظ ہی استعمال کیا گیا ہے۔[1]

انسان کے نسلی رشتے اور خاندانی تعلّقات بہت اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں سے متعلّق ہر انسان کی ذمہ داریاں متعیّن ہیں۔ خود رحم کا لفظ رحمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ جو لوگ رحم اور خون کے رشتوں میں جُڑے ہوئے ہیں ان کے درمیان شفقت و رحمت کا رشتہ ہے۔ اس کا تعلّق اللہ کے نام یعنی الرّحمٰن (بہت مہربان) سے بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا،

ان الرحم شجنة من الرحمن فقال اللّٰہ من وصلک وصلتہ ومن قطعک قطعتہ۔

"یقیناً رحم کا نام الرّحمٰن سے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو کوئی تم میں سے اپنے رشتے برقرار رکھے گا تو میں بھی اسکے رشتہ کو برقرار رکھونگا اور جو کوئی تم میں سے قطع تعلّقی کرے گا تو میں بھی اسکو قطع تعلق کر دونگا۔" (البخاری)

---

[1] دیکھیں، ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص۔316۔

Marfat.com

”چالیس دن تک“

انسان کی تخلیق کا وہ مرحلہ جسے واضح طور پر قرآن نطفہ کہتا ہے قرآن کے مطابق 40 دن کی مدّت پر مُحیط ہوتا ہے۔ اس کے لفظی معنی ”مائع کی ایک بوند“ ہیں۔ لیکن جیسے کہ البر نے نشاندہی کی یہ لفظ قرآن وحدیث میں مختلف انداز میں استعمال ہوا ہے البر کے مطابق یہ لفظ تین مختلف طریقوں سے استعمال ہوا ہے؛[1]

اوّل: مرد کا نطفہ یا مرد کا مواد(gomate) جس کی طرف قرآن پاک کی دوج ذیل آیت میں ارشاد ہے،

اَیَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ یُّتْرَکَ سُدًی۔ اَلَمْ یَکُ نُطْفَۃً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی۔ ثُمَّ کَانَ عَلَقَۃً فَخَلَقَ فَسَوّٰی۔ فَجَعَلَ مِنْہُ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَ الْاُنْثٰی۔ اَلَیْسَ ذٰلِکَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓی اَنْ یُّحْیِۦَ الْمَوْتٰی۔

”کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟۔ کیا وہ ایک حقیر پانی کا نطفہ نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے؟۔ پھر وہ ایک لوتھڑا بنا {زیادہ بہتر ترجمہ ’چپکی یا جُڑی ہوئی چیز‘ (مترجم)}، پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا اور اس کے اعضا درست کیے۔ پھر اس (مذکر) سے مرد اور عورت کی دو قسمیں بنائیں۔ کیا وہ (خداوند) اس پر قادر نہیں ہے کہ مرنے والوں کو پھر سے زندہ کر دے؟ [یقیناً، بے شک]۔“(القیامۃ:40-36)

ایک دوسری آیت میں ہے،

وَ اَنَّہٗ خَلَقَ الزَّوْجَیْنِ الذَّکَرَ وَالْاُنْثٰی۔ مِنْ نُّطْفَۃٍ اِذَا تُمْنٰی۔

”اور یہ کہ اُسی نے نر اور مادہ کا جوڑا پیدا کیا۔ ایک بُوند سے جب وہ ٹپکائی جاتی ہے۔“(النجم:46-45)

اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں،

---

[1] دیکھیں، البر، ص۔57۔ زیریں حاشیہ۔

Marfat.com

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ۔ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ۔

"کبھی تم نے غور کیا، نطفہ جو تم ڈالتے ہو،۔اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اُس کے بنانے والے ہم ہیں؟" (الواقعہ:59-58)

اس آیت پر تبصرہ کرتے ہوئے البر لکھتے ہیں،

پیدا ہونے والے کی صنف کا انحصار مرد (کے نطفے) پر ہوتا ہے۔ یہ صاف طور پر کہا گیا ہے کہ مذکّر اور مؤنّث کا بننا اس (نطفے) مواد سے ہے جو خارج ہوتا ہے۔ ہمیں اب یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ صِنف کا تعیّن اس جرثومے سے ہوتا ہے جو بیضے کی افزائش کرتا ہے۔ اگر جرثومے میں ایکس لونیہ (X chromosome) ہو اور وہ بیضے کی افزائش کرے جس میں ہمیشہ ایک ایکس لونیہ (X chromosome) ہی ہوتا ہے تو نتیجہ لڑکی کی ولادت ہی ہوگا، جبکہ افزائش کرنے والے جرثومے میں وائی لونیہ (Y chromosome) ہو تو نتیجہ لڑکے کی پیدائش ہی ہوگا۔

دوسرا اہم نکتہ جو قرآن نے واضح طور پر بیان کر دیا وہ یہ ہے کہ مادّۂ تولید کا ایک تھوڑا سا حصہ ہی ابتداً جنین (embryo) کی تشکیل میں حصہ لیتا ہے۔۔۔۔(مثال کے طور پر اوپر درج کیا گیا اللہ تعالیٰ کا ارشاد)، "کیا وہ محض ایک مائع کی بوند نہ تھا اس مواد میں سے جو کہ خارج کیا گیا؟"۔۔۔ ہمیں اب معلوم ہوا ہے کہ خارج ہونے والے مواد کا صرف 0.5 فیصد ہی مادّۂ تولید پر مشتمل ہوتا ہے۔۔۔۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، "سارے مواد میں سے (جو خارج ہوتا ہے) انسان کی تخلیق نہیں ہوتی بلکہ صرف اس کے ایک چھوٹے سے حصے سے۔" (مسلم کی روایت کے مطابق)[1]

---

[1] البر، ص ص۔59-58۔

Marfat.com

دوم: عورت کا نطفہ، سورۃ الانسان کی دوسری آیت میں آتا ہے **نطفۃ امشاج** یعنی جنسی مائع کا آمیزہ

اس سے نطفہ کے معنوں کا حوالہ عورت کی طرف ہوتا ہے۔ دراصل، ابنِ عباس کی تفسیر کے مطابق اس کا اطلاق مرد اور عورت دونوں کے نطفوں پر ہوتا ہے۔[1] البر کے مطابق قرآن کا بیان اس امر کو قطعیت کے ساتھ واضح نہیں کرتا جبکہ مسند احمد کی ایک حدیث اسے واضح کر دیتی ہے، جس میں رسول ﷺ ایک یہودی کو بتاتے ہیں کہ انسان کی تخلیق مرد اور عورت کے نطفوں سے ہوئی۔ البر اس کے بعد لکھتے ہیں "یہ ایک چونکا دینے والی خبر ہے، کیونکہ ہمیں (علمِ طب کے ذریعے) حال ہی میں یہ معلومات حاصل ہوئی ہیں کہ نر اور مادا دونوں کا حصہ انسان (حیوان) zygote (بارآور بیضہ) کے تشکیل پانے میں برابر کا ہے"۔[2]

اس لفظ نطفے کا یہی تیسرا استعمال یہاں دلچسپی کا محور ہے، جبکہ مرد کا اور عورت کا نطفہ رحمِ مادر میں یکجا ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے جسے آج سائنسدان "performational stage" کہتے ہیں۔[3] ابنِ اطہیر کے مطابق حدیث کے اس حصے کو دو میں سے ایک طریقے سے سمجھا جا سکتا ہے: یا تو یہ نطفہ رحمِ مادر میں 40 دن تک جوں کا توں موجود رہتا ہے یا یہ نطفہ ان چالیس دنوں میں نشوونما پاتا ہے اور اگلے مرحلے کیلئے تیار ہوتا ہے۔[4] یہ دوسری توضیح آج کے سائنسی حقائق سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔

---

[1] البر، ص۔59۔

[2] البر۔ ص۔59۔

[3] البر، ص ص۔ 61-60، پر بعض سندوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ تاہم، یہ وہ مقام ہے جہاں سائنسی حقائق اور نظریات کے درمیان موجود حد بہت سے لوگوں کے لیے غیر واضح ہو جاتی ہے۔

[4] ابنِ اطہیر کا حوالہ ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص۔315 پر دیا گیا ہے۔

Marfat.com

"پھر وہ اس عرصے کے دوران ہی ایک چپکی ہوئی چیز (علقہ) ہوتا ہے"

انسانی تخلیق کے اگلے مرحلے کو رسول اللہ ﷺ نے علقہ کہا ہے۔ البر نے علقہ کو (جسے وہ alqkah لکھتے ہیں) مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

عربی لفظ علقہ[1] کے لفظی معنی ہیں کوئی چیز جو چپکی ہوئی یا جڑی ہوئی ہوتی ہے۔ اس لفظ کے ایک اور معنی جونک (leech) بھی ہیں، جونک اپنی چمٹ جانے کی خصوصیت کیلئے مشہور ہے جبکہ وہ کھال سے چمٹ کر خون پیتی ہے، یہ طریقہ علاج کی غرض سے (خون نکالنے میں) استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک اور معنی جو عربی زبان میں کبھی کبھار استعمال ہوتے ہیں۔ ۔۔۔اُسے خون گاؤ (blood clot) یا (congealed blood) کہتے ہیں۔

اسکے بعد البر نے مختلف اقسام کے چپکنے کی تفصیل بیان کی جو کہ نطفے کے بعد والے مرحلے میں وجود پاتا ہے وہ اپنے تفصیلی بیان کا خلاصہ مختصراً یوں پیش کرتے ہیں،

مختصراً یہ کہ ــــ ساتویں سے اکیسویں دن تک تین آپس میں متصل عوامل واقع ہوتے ہیں جن میں چپکنے کا عمل زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

(1) ساتویں دن سے نبان کی تنصیب (implantation of the blastocyst)[2] کا عمل شروع ہوتا ہے اور یہ دسویں دن مکمل طور پر گڑہ (embedded) جاتا ہے۔

---

[1] البر کی کتاب میں انہوں نے "Alakah" لکھا ہے۔

[2] نبان (blastocyst) "اندر سے خالی خلیوں کا کرّہ ہوتا ہے جو جاندار بچے (embryo) کی ارتقا کا ابتدائی مرحلہ ہوتا ہے، یہ دیگر جانوروں میں موجود blastula کے تقریباً متوازی اصطلاح ہے۔" دیکھیں The Hutchinson Dictionary of Science کو The Learning Company for Greater Knowledge, Digital Library [Computer Software] (Cambridge, MA, 1997).

Marfat.com

(2) تیرہویں(13th) یا چودہویں(14th) دن جنینی جھلّی سے ابھرنے والا خمل یا چھدسا بال chorionic villi[1] پہلی بار ظاہر ہوتی ہے اور جلد ہی پورے blastocyst کو محصور کرلیتی ہے اور گیند نما اس تشکیل کو بچہ دانی(uterus) کے ساتھ villi کی مدد سے جوڑ دیتی ہے۔

(3) جوڑنے والا تناخاص کچے بچے(the embryonic disc) کو اسکے اصل خول سے جوڑدیتاہے، جنینی جھلّی(amniotic sac) اور زردی کی جھلّی(yolk sac) کے ساتھ بیرونی گیند جھلی chorion سے جوڑدیتاہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ چپکنے یا جُڑنے کی کیفیات تین مختلف اقسام کی ہوتی ہیں، جن میں نشوونما پاتا ہوا بیضہ(ovum) رحم مادر سے جُڑتا ہے۔ اس کیفیت کے بیان کیلئے قرآنی اصطلاح یعنی علقہ سے بہتر کوئی اور لفظ نہیں ہوسکتا۔[2]

---

[1] chorion "رینگنے والے جانوروں، پرندوں اور دودھ پلانے والے جانوروں کے جنین کی تین جھلّیوں میں سے بیرونی جھلّی ہوتی ہے جو ان اقسام کے جانوروں کے جنین کو ڈھانکے ہوئے ہوتی ہے، علافِ جنین(amnion) ان تین جھلّیوں میں سے اندرونی جھلّی ہوتی ہے۔" [The Hutchinson Dictionary of Science] جو کہ خمل(Villi کی جمع ہے) "(1): ایک چھوٹا سا انگلی نما ابھار جو کہ کم وبیش ایک دبیز پردے کی طرح ہوتا ہے اور ایک مخملی شکل رکھتا ہے {یہاں سے آگے دی گئی تفصیل غیر متعلّقہ ہے اسلیے اسے مختصر کردیا گیا ہے} (ب) اکثر دودھ پلانے والے جانوروں کے ارتقاپاتے ہوئے نبان کی بیرونی جھلّی پر شاخ دار ابھاروں کا رونما ہونا جو کہ ایک جھلّی کے مخصوص حصوں تک محدود رہتا ہے یا بعض حصوں میں سطح پر بکھری سی ترتیب میں نالیوں کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور جفت جنین(placenta) کی تشکیل میں مددگار ہوتا ہے۔" دیکھیں، Webster's Medical Desk Dictionary on the Learning Company for Greater Knowledge, Digital Library [Computer Software] (Cambridge, MA, 1997)۔

[2] البر، ص ص۔67-68۔

Marfat.com

"پھر وہ اس عرصے کے دوران ہی ایک چبائے ہوئے لوتھڑے کی طرح ہوتا ہے"

اگلا مرحلہ مضغہ کا ہے اور اس کا ذکر قرآن میں اور اس حدیث میں موجود ہے۔ اس مرحلے کے بارے میں البر لکھتے ہیں،

> المضغہ[1] عربی میں ایک چبائے ہوئے لوتھڑے کو کہتے ہیں، کوئی چیز جو کچی چبائی گئی ہو۔ یوسف علی نے اپنے ترجمۂ قرآن میں اسے morsal یا گوشت کا لقمہ لکھا ہے جو لفظِ مضغہ کا درست ترجمہ نہیں۔ محمد اسد، مورث بکائل Maurice Bucialle اور دیگر نے ترجمے میں درست لفظ کا انتخاب کیا ہے اور وہ اسے چبایا ہوا لوتھڑا کہتے ہیں۔[2]

ایک بار پھر البر نے جنین کی اِرتقا پر کچھ تفصیل سے بحث کی ہے، اور تصویر کشی سے مدد لی ہے۔ اس عرصے کے دوران، باترتیب اعضا جنہیں (somites)[3] کہا جاتا ہے پروان چڑھتے ہیں۔ انہی سے انسانی ہڈیوں کا ڈھانچہ اور پٹھے بنتے ہیں۔ اسلیے یہ ایک قرینے سے پھیلے ہوئے کئی ابھار اور دندانے ہوتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ گوشت کے ایسے لوتھڑے ہوتے ہیں جیسے انہیں چبایا گیا ہو اور دانتوں کے نشان ان پر نمایاں ہوں۔ حمل کے بعد یہ سارا سلسلہ چھٹے ہفتے یا 42 دنوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔

---

[1] البر کی کتاب میں انہوں نے Mudhghah کو "Modhga" لکھا ہے۔

[2] البر، ص۔71۔

[3] باترتیب اعضا (somites) "ایک سے حصے جو باترتیب ابتدائی شکل میں ایک سے ہوتے ہیں کہ جن میں ریڑھ دار اور اعلیٰ درجہ کے غیر ریڑھ دار جانوروں کے منقسم ہوتے ہیں اور یہ عام طور پر جنین کے مرحلے ہی میں، واضح طور پر پہچانے جاتے ہیں، کچھ ذرا تبدیل شدہ حالت میں بہت سے غیر ریڑھ دار جانوروں میں پہچانے جاتے ہیں (جیسا کہ annelid worms)، اور پہچانے جاسکتے ہیں بالغ اعلیٰ ریڑھ دار جانوروں میں صرف مخصوص حصوں میں ترتیب دیے ہوئے ڈھانچے (جیسا کہ craniel اور spinal vertebrae یا nerves)" (Webster's Medical Desk Dictionary)

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث حمل کے بعد کے تقریباً 40 دنوں کا ذکر کرتی ہے۔ زیرِ نظر حدیث بھی ایسا ہی بیان کرتی ہے۔ اگر اسے اس اضافی لفظ کے بغیر دیکھا جائے جو النووی کی اربعین میں حدیث کے متن میں موجود ہے۔ ابراہیم نے ان تقریباً 40 دنوں کی اہمیت کے بارے میں لکھا ہے جن کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے، وہ لکھتے ہیں،

> ابتدائی جنین (embryo) کا مرحلہ حمل کے دو ہفتے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس وقت اعضا کی تفریق شروع ہوتی ہے۔ تمام اندرونی اعضا جو کہ ایک انسان میں وضع ہونے والے ہوتے ہیں وہ سب ایک ابتدائی ساخت (rudimentary form) میں چھ ہفتوں (42 دنوں) کے اندر واضح ہو جاتے ہیں۔ تخلیق کی یہ اوّلین شکل آٹھ ہفتہ سے لے کر پیدائش تک کے عرصے میں جنین (fetus) کہلاتی ہے۔ اس عرصے کے دوران اسکی مسلسل نشوونما اور اسکے بڑھنے کا عمل جاری رہتا ہے، لیکن کسی "نئی چیز کا اضافہ نہیں ہوتا"، یہ وہ عرصہ ہے جس میں جسم کی ابتداء ہو چکی ہوتی ہے، اسے پیدائش کیلئے تیار کیا جاتا ہے۔[1]

"اس کے بعد اسکے پاس فرشتہ بھیجا جاتا ہے۔"

یہاں رسول اللہ ﷺ نے جو لفظ استعمال کیا وہ ہے "وہ فرشتہ" بجائے اسکے کہ "ایک فرشتہ"۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جنین کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ایک خاص فرشتے کی ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ مختلف فرشتوں کی مخصوص ذمہ داریاں ہوتی ہیں جیسے کہ اللہ کے حکم کو جنین تک پہنچانے کی ذمہ داری۔

---

[1] ابو فضل محسن ابراھیم، Abortion, Birth Control & Surrogate Parenting: An Islamic Perspective (American Trust Publication, 1989), P.74۔

Marfat.com

اوپر بیان کیے گئے تخلیق کے مراحل جو جنین پر گزرتے ہیں ان کی تکمیل کے بعد فرشتے کی آمد ہوتی ہے۔ اس نکتے پر آگے قدرے تفصیل کے ساتھ بحث کی گئی ہے۔

"پھر وہ اس کے اندر روح پھونکتا ہے"

حدیث کے اس حصے سے متعلّق کئی اہم سوالات ہیں جن کا احاطہ کرنا ضروری ہے۔ پہلا سوال یہ ہے: ایسا ٹھیک کس وقت ہوتا ہے؟ یعنی کہ فرشتے کی رحمِ مادر میں آمد کب ہوتی ہے جبکہ وہ تخلیق میں روح پھونکتا ہے اور ان معاملات کو متعیّن کر دیا جاتا ہے جن کا ذکر حدیث میں آیا ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے: روح دراصل ہے کیا چیز؟ ہم یہاں دوسرے سوال کو پہلے دیکھتے ہیں۔

روح دراصل ہے کیا؟ روح کسی فرد کی "زندگی" ہے، اللہ تعالیٰ کا قرآنِ پاک میں ارشاد ہے،

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔

"یہ لوگ تم سے روح کے متعلّق پوچھتے ہیں۔ کہو 'یہ روح میرے ربّ کے حکم سے آتی ہے، مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی بہرہ پایا ہے۔' (تمہیں تو تھوڑا ہی سا علم عطا ہوا ہے)"

(سورۃ بنی اسرائیل:85)[1]۔ یہ ایک ایسی حیران کُن حقیقت ہے جسے نوعِ انسان کو تسلیم کرنا

---

[1] یہ بات نوٹ کرنے والی ہے کہ روح جس کا حوالہ اس آیت میں دیا گیا اس کے بارے میں اختلافِ رائے موجود ہے کہ یہ کیا ہے۔ مُفسّرینِ قرآن نے چھ مختلف آراء کا ذکر کیا ہے، جن میں شامل ہیں: (1) روح جو انسانوں میں پھونکی جاتی ہے؛ (2) ایک خاص فرشتہ؛ (3) اللہ کی ایک خاص تخلیق جس کی صِفات فرشتوں جیسی اور ظاہر انسانوں جیسا ہے؛ (4) جبریل علیہ السلام؛ (5) قرآن بذاتِ خود؛ (6) عیسیٰ علیہ السلام۔ دوسرے نمبر پر دی گئی رائے کو ایک حدیث کی صورت میں روایت کیا گیا ہے اور علیؓ ابن ابی طالب کے ایک قول کے طور پر بھی روایت کیا گیا ہے۔ ابنِ کثیر اس حدیث اور اس بیان کو یہ کہہ کر مُسترد کرتے ہیں کہ یہ ایک حیران کُن اور قابلِ اعتراض بات ہے۔ ابنُ القیم دعویٰ کرتے ہیں کہ قرونِ اولیٰ کے اہلِ علم کی اکثریت نے یہ کہا کہ یہ روح جس کا ذکر یہاں کیا گیا ہے، یہ انسانوں کی روح نہیں۔ بلکہ، یہ حوالہ ہے اس فرشتے کی طرف جو قیامت کے روز اللہ کے ہمراہ آئے گا، جیسا کہ سورۃ النبا کی آیت 38 میں ذکر کیا گیا ہے۔ وہ اپنی دلیل کی حمایت میں یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں جس کا حوالہ دیا گیا اس کے بارے میں ہم لاعلم ہیں سوائے اسکے جو وحی کے ذریعے بتایا گیا۔ تاہم، "روح" جو انسانوں میں ہوتی ہے وہ کوئی ایسی چیز نہیں جو

Marfat.com

ہو گا، ساری سائنسی ترقی کے باوجود، نوعِ انسان کے پاس اس امر سے متعلّق بہت کم معلومات ہیں۔ یہاں تک کہ نوعِ انسانی خود اپنے آپ کے بارے میں یا اس کے بارے میں کہ جو چیز اُسے حرکت و حرارت دیئے ہوئے ہے، مکمل اندھیرے میں ہے۔ نفس کی حقیقت اور اسکی کارکردگی کے بارے میں بھی ہمارا علم بہت محدود ہے۔ یہ مانا جاتا ہے کہ ایک انسان اس وقت تک زندہ ہے جب تک اس کے جسم کے ساتھ روح جڑی ہوئی ہے اور جب وہ اس کے جسم سے رُخصت ہو جائے تو وہ مر جاتا ہے۔

اسلامی عقائد پر اپنی معرکہ آرا تصنیف میں ابنِ ابو العز روح اور نفس کے تصوّر کو تفصیل سے زیرِ بحث لائے ہیں۔ اس بحث کا اختصار پیشِ خدمت ہے:

> نفس کی نوعیّت کے بارے میں لوگ مختلف آراء رکھتے ہیں۔ کیا یہ جسم کا ایک حصہ ہے یا اُسے پیش آنے والا ایک حادثہ۔[1]؟ یا یہ اس بدن کے اندر جس میں وہ رہتا ہے ایک اور بدن ہے؟ یا یہ کوئی خالص مادّے کی صورت ہے؟ اور پھر یہ کہ کیا یہ اور روح ایک ہی ہیں یا مختلف؟۔۔۔

جانی پہنچانی نہ ہو اور یہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں نسل در نسل لوگوں نے بات کی ہے۔ جس پیرائے میں آیت آتی ہے القاسمی اس سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ روح سے یہاں مراد قرآن ہے، جو کہ اوپر دی گئی آراء میں سے پانچویں رائے ہے۔ جمہور مفسرین اس رائے کے حامی ہیں کہ "روح" سے یہاں مراد انسانی روح ہے۔ یہ الطبری، البغوی، ابنِ الجوزی، ابنِ عطیّہ، ابو حیّان، ابنِ کثیر، ابنِ حجر (جیسا کہ عبد الرّحیم نے بیان کیا) اور الآلوسی کی رائے ہے۔ یہی درست تشریح معلوم ہوتی ہے، واللہُ اعلم بالصواب۔ جیسا کہ محمد ابنُ القیم، الرّوح فی الکلام علی ارواح الاموات والاحیاء (ریاض: دار ابنِ تیمیہ، 1992)، جلد2، ص ص۔ 517-518؛ القاسمی، محاسن، جلد10، ص3994؛ الطبری، جلد9، ص۔15، ص ص۔ 156-157؛ البغوی، تفسیر، جلد5، ص ص۔ 125-126؛ ابن الجوزی، زاد، جلد5، ص۔58؛ عبد الحق ابنِ عطیّہ، المحرّر الواجز فی تفسیر الکتاب العزیز (بیروت: دار الکتب ابو حیّان، الحبر المحیط فی التفسیر (مکّہ: المکتبہ التجاریہ، تاریخ ندارد)، جلد7، ص۔106؛ ابنِ کثیر، تفسیر (جمیعہ) جلد3، ص ص۔ 68-69؛ السّید عبد الرّحیم، زیریں حاشیے الماوردی، جلد3، ص۔270؛ محمود الآلوسی، روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع الثانی (قاہرہ: مکتبہ دار التراث، تاریخ ندارد)، جلد15، ص۔151۔

[1] ارسطو کے فلسفے میں حادثات کے معنی ہیں "خصلتیں جو کہ ان مادّوں کے لیے ضروری نہ ہوں جن میں وہ ظہور پذیر ہوتی ہیں۔" دیکھیں New Encyclopedia Britannica, Vol 25, P.584۔

Marfat.com

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ روح ابدی ہے۔ لیکن انبیا علیہ السلام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ مُنحصر ہے۔[1] جس کی تخلیق، تشکیل، قابو اور اس کی توانائی اللہ سے منسوب ہے۔ انبیا کے ذریعے آئے ہوئے تمام مذاہب کا بنیادی اُصول ہے کہ یہ دنیا مُنحصر ہے، صحابہؓ اور تابعین کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ بعد میں آنے والے لوگوں میں سے بعض لوگ جن میں قرآن اور سُنّت کے علم کا فقدان ہے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روح ابدی ہے۔ انہوں نے یہ کہا کہ روح ایک امر (حکم) ہے اللہ کا اور اس وجہ سے مخلوق نہیں۔ یہ لوگ اس آیت سے اِستدلال کرتے ہیں جس میں اللہ نے روح کو اپنے آپ سے منسوب کیا، جیسے کہ، "کہو 'یہ روح میرے ربّ کے حکم سے آتی ہے،'" (بنی اسرائیل:85) اور "اس میں اپنی رُوح سے کچھ پھونک دوں" (الحجر:29)۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے روح کو اپنے آپ سے منسوب کیا ہے۔ بالکل اُسی طرح جیسے اس نے علم، طاقت، سننے، دیکھنے اور ہاتھوں کو اپنے آپ سے منسوب کیا ہے۔ کچھ اور لوگ ہیں جو اس معاملے میں اپنی کوئی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں۔

اہلِ سُنّت و الجماعت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ روح مخلوق ہے۔ ان کے اس اتفاق کی محمد ابنِ نصر المروازی، ابنِ قطیبہ اور دیگر لوگوں نے خبر دی ہے۔ اس نقطۂ نظر کی موافقت میں ثبوت کہ روح مخلوق ہے، ایک آیت یہ ہے، "ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے" (الرعد:16)۔ یہ ایک غیر مشروط عمومی بیان ہے جو کسی صورت میں بھی مخصوص نہیں کیا گیا ہے۔ اس کا اطلاق دوسری چیزوں کے علاوہ روح پر بھی ہوتا ہے۔ اس سے یہ کہہ کر بچا نہیں جا سکتا کہ پھر تو تمام

---

[1] منحصر ایک فلسفیانہ اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں، "منطقی طور پر غیر ضروری، خالق اور ہر جاندار کے بنانے والے سے یکسر مختلف، جو کہ منطقی طور پر لازمی ہے۔ جیسا کہ، Webster's Dictionary on the Learning Company for Greater Knowledge, Digital Library [Computer Software] (Cambridge, MA, 1997)_

Marfat.com

دوسری صفاتِ الٰہی پر بھی اس کا اطلاق ہو گا۔ کیونکہ صفات اللہ کی ذات کا حصہ ہیں۔ اللہ کا نام اللہ ہے اور اُسکی تمام صِفاتِ کاملہ پر منطبق ہوتا ہے۔ اُسکا علم، اسکی قُدرت، اُسکی ہستی اُسکے سننے کی، اُسکے دیکھنے کی اور اُسکی تمام دیگر صفات اُسکی ذات کا حصہ ہیں۔ اُسکی اصل جو اُسکی صِفات کے ساتھ ہے وہ الخالق کی ہے؛ اس کے سوا سب مخلوق ہیں۔ یہ بات بے شک وشبہ معلوم ہے کہ روح نہ تو اللہ ہے اور نہ ہی اسکی کوئی صفت؛ یہ صرف اُس کی ایک تخلیق ہے۔۔۔۔

یہ نقطۂ نظر اپنے لیے اس آیت سے کوئی مدد نہیں پاتا کہ ''روح میرے ربّ کے حکم سے ہے۔''۔۔۔۔ یہاں پر امر کے معنی حکم نہیں بلکہ ایک چیز ہے جسے حکم دیا گیا (المعمور) اسطرح اسم مصدر (verbal noun) کو فعل (verb) کے مفعول (object) کے طور پر استعمال کرنے کا اسلوبِ زبان بہت عام ہے۔ دوسری دلیل کہ اللہ نے روح کو اپنے آپ سے منسوب کیا ہے بے وزن ہے۔ جو چیزیں اللہ سے منسوب ہیں وہ دو اقسام کی ہیں: ایک تو وہ صِفات جیسے علم، قوتِ بیان، سماع، بصر اور اسی طرح اور۔ یہ اللہ سے اسی طرح منسوب ہیں جیسے صِفات اپنے فاعل کے ساتھ منسوب ہوتی ہیں۔ دوسری قسم ایسی چیزوں پر مشتمل ہے جو اپنے تئیں اللہ سے الگ موجود ہوتی ہیں جیسے گھر، مادا اونٹنی (نقاہ)، ملازم (عبد)، پیغمبر (رسول) اور روح۔ یہ چیزیں اللہ سے اس طرح منسوب ہیں جیسے چیزیں اپنے خالق سے منسوب ہوتی ہیں۔ یہ انتساب صرف اس چیز کی اہمیت اور اعزاز پر دلالت کرتا ہے جسے منسوب کیا گیا ہو، اور یہ اسے اپنی ہی قسم کی دوسری چیزوں سے ممتاز کرتا ہے۔۔۔

روح کی اصل حقیقت کی نسبت سے بھی اختلاف موجود ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ ایک جسم ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ ایک حادثہ ہے۔ کچھ اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ

Marfat.com

نہیں جانتے کہ یہ کیا ہے، ایک مادّی چیز یا ایک حادثہ۔ بعض کا کہنا ہے کہ یہ کچھ نہیں سوائے، اسکے کہ یہ چار فطری اجزا ہیں۔[1] بعض کہتے ہیں کہ یہ خالص خون ہے کسی بو کے بغیر اور کسی بو باس رکھنے والی ملاوٹ کے بغیر۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ فطری حرارت ہے جو بذاتِ خود زندگی ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ غیر مخلوط (non-composite) مادّی ہستی (entity) ہے جو سارے عالمِ حیوانی میں پھیلی ہوئی ہے جو اس عالم کو رواں رکھتی ہے اور یہ اپنی ماہیت اور جسم میں تقسیم نہیں ہوتی اور یہ کہ تمام عالمِ حیوان میں ایک ہی روح موجود ہے۔ کچھ اور لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ سانس ہے جو اندر باہر آتی جاتی ہے۔ اور ان کے علاوہ اور بھی کئی نقطہ ہائے نظر ہیں۔

لفظِ انسان کی مناسبت سے یہ کہ، آیا اس سے مراد محض روح ہے یا روح اور جسم دونوں، یا دونوں ایک ساتھ یا ان میں سے کوئی ایک؟۔۔۔ سچ یہ ہے کہ لفظِ انسان دونوں پر بھی منطبق ہوتا ہے اور ان میں سے کسی ایک پر بھی منطبق ہوتا ہے اس کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ بات کس پیرائے میں کی جارہی ہے۔۔۔

جو کچھ قرآن، سُنّت، صحابہؓ کے اجماع اور عقلی سوچ بچار سے ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ روح کے خدوخال کا جوہر اُس مادّی جسم سے مختلف نوعیت کا ہے جو نظر آتا ہے۔ یہ تجسیم کسی کم وزن (نختالیس، نازک، نحیف) اور بلند و ارفع ماخذ (منبع) سے ہے۔ یہ بہت نحیف زندہ اور گردش کرتی ہوئی ہوتی ہے۔ اس کی تنفیذ انگواں (limbs) سے اسطرح ہوتی ہے جیسے پانی آبپاشی کے ماخذ سے

---

[1] یونانی اور عرب طب میں انسانی جسم کو چار فطری اجزا کا مجموعہ سمجھا جاتا تھا۔ اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ جب یہ اپنا توازن کھو دیں، تو اجسام مناسب طور پر کام نہیں کرتے۔

Marfat.com

شاخوں میں پھیلتا چلا جاتا ہے یا زیتون کا تیل زیتون کے درخت کی شاخوں میں پھیلتا ہے یا جیسے آگ کوئلے میں پھیل جاتی ہے۔ جب تک انگوں کی صحت اچھی اور اس قابل ہے کہ وہ اس نحیف تجسیم (روح) کے اثر کو برداشت کر سکتے ہیں روح بدن کے اندر موجود رہتی ہے اور بدن کے احساس، اسکی حرکت اور اِرادے کو قوت فراہم کرتی ہے۔ لیکن جب یہ خراب ہو جائیں تو ان مرکبّات کا آمیزہ بھی خراب ہو جاتا ہے اور اس میں اسکے {روح کے} اثر کو برداشت کرنے کی سکت نہیں رہتی اور روح بدن سے جدا ہو کر عالمِ ارواح میں چلی جاتی ہے۔

اس کا ثبوت اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ”وہ اللہ ہی ہے جو موت کے وقت رُوحیں قبض کرتا ہے“ (الزمر:42)۔ یہ بیان بتاتا ہے کہ روح کو موت آتی ہے، اسے رکھا جاتا ہے، اور اسے بھیجا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: ”کاش تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھ سکو جب کہ وہ سکراتِ موت میں ڈبکیاں کھا رہے ہوتے ہیں اور فرشتے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ ’لاؤ، نکالو اپنی جان {روح}‘ “ (الانعام:93)۔ اس بیان میں یہ ہے کہ فرشتے اپنے ہاتھ بڑھا کر روح کو پکڑتے ہیں۔ یہ بتاتا ہے کہ روح باہر آتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ روح پر اس دن عذاب ہوتا ہے اور وہ اپنے ربّ کے پاس واپس لوٹ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں: ”وہی ہے جو رات کو تمہاری رُوحیں قبض کرتا ہے اور دن کو جو کچھ تم کرتے ہو اسے جانتا ہے، پھر دوسرے روز وہ تمہیں اِسی کاروبار کے عالم میں واپس بھیج دیتا ہے“ (الانعام:60)۔ یہ بیان بتاتا ہے کہ روح رات کو چلی جاتی ہے اور دن ہونے پر دوبارہ اجسام میں آجاتی ہیں۔ اور فرشتے موت کے وقت انہیں لے لیتے ہیں۔

Marfat.com

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: "(دوسری طرف ارشاد ہو گا) اے نفسِ مطمئن! (اے وہ جس کا دل اپنے ربّ پر جما رہا) چل اپنے ربّ کی طرف اس حال میں کہ تو (اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے ربّ کے نزدیک) پسندیدہ ہے۔ شامل ہو جا! میرے (نیک) بندوں میں اور داخل ہو جا! میری جنّت میں" (الفجر:30-27)۔ یہاں پر روح سے متعلّق یہ بیان ہے کہ وہ واپس ہوتی ہے، داخل ہوتی ہے اور محفوظ ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "جب روح قبض ہوتی ہے تو آنکھیں اُسکا تعاقُب کرتی ہیں۔"[1] یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ روح قبض ہوتی ہے اور نظریں اُسے دیکھتی ہیں۔ بلالؓ سے مروی حدیث میں ہے کہ "ارواح قبض کی جاتی ہیں جب وہ چاہتا ہے اور واپس ہوتی ہیں جب وہ چاہتا ہے۔"---[2]

یہ سب وہی ہے جس پر ہمارے صالح اسلاف متّفق تھے اور جس پر کوئی عقلی سوچ بچار سے پہنچ جاتا ہے۔ وہ جو اس سے مختلف آراء رکھتے ہیں صرف غلط مفروضات، نامعقول تصوّرات کی اقتدا کرتے ہیں اور ان آراء کو کسی طور پر بھی ان مستند دلائل کے مقابلے میں تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ جن کو وحی کے ذریعے بیان کر دیا گیا ہے۔

جہاں تک اس سوال کا تعلّق ہے کہ آیا نفس اور روح دو مختلف چیزیں ہیں یا یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ صحیح نظریہ یہ ہو گا کہ ان الفاظ کے کئی معنی ہیں، جن میں سے بعض ایک سے ہیں اور بعض مختلف---

---

[1] اسے مسلم نے محفوظ کیا۔

[2] اسے البخاری نے محفوظ کیا۔

Marfat.com

اور اس سوال پر کہ آیا روح فانی ہے یا نہیں لوگوں نے مختلف آراء رکھی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ فانی ہے کیونکہ، یہ نفس ہے اور ہر نفس کیلئے موت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے "ہر چیز جو اس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے۔ اور صرف تیرے ربّ کی جلیل و کریم ذات ہی باقی رہنے والی ہے" (الرّحمٰن:-26 27)، "ہر چیز ہلاک ہونے والی ہے سوائے اُس ذات کے" (القصص:88)۔ یہ لوگ کہتے ہیں جب فرشتے بھی فنا ہو جائیں گے انسانوں کی روحیں بھی یقیناً فنا ہو جائیں گی۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ روحیں فنا نہیں ہونگی، کیونکہ ان کی تخلیق ہمیشہ رہنے کیلئے ہوئی ہے، صرف جسم ہیں جو فنا ہونگے۔ اس پر دلیل کے طور پر یہ لوگ وہ حدیث لاتے ہیں جس میں ہے کہ روحیں جسم سے نکل جانے کے بعد بھی عذاب محسوس کریں گی اور فرحت محسوس کریں گی اور یہ اس وقت تک ہو گا جب تک اللہ تعالیٰ ان کو نئے جسم نہیں دے دے گا۔ {جیسا کہ حدیث نمبر2 کی تفسیر میں ابنِ عثیمین کے حوالے سے بیان ہوا ہے کہ دوبارہ دیئے جانے والے جسم دراصل وہی جسم ہوں گے جو دنیاوی زندگی میں بھلائی و بُرائی کے اعمال کرتے رہے کیونکہ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ سزا یا جزا اس جسم کو ہی دی جائے جو کہ اچھے یا بُرے اعمال کرتے رہے نہ کہ یہ سزا اور جزا کا عمل کسی نئے جسم پر ہو}

اس معاملے میں صحیح نقطۂ نظر کو شاید یوں بیان کیا جا سکتا ہے: ہم روح کی موت کو اس کے جسم سے نکل جانے کے عمل سے تعبیر کریں گے نہ کہ اس کی تباہی سے۔ اس حساب سے روح فانی ہے۔ لیکن اگر کوئی اس سے یہ سمجھے کہ روح مکمل طور پر برباد ہو کر غائب ہو جاتی ہے تو پھر یہ جان لیجئے کہ یہ فانی نہیں اور

Marfat.com

موت کے بعد بھی موجود رہتی ہے اور درد محسوس کرتی ہے اور فرحت محسوس کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اہلِ جنّت کے بارے میں فرماتے ہیں،

"وہاں وہ موت کا مزہ کبھی نہ چکھیں گے۔ بس دنیا میں جو موت آچکی سو آچکی" (الدخان:56)۔ یہ موت روح کے بدن سے نکل جانے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ جہاں تک اہلِ نار کا تعلّق ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وہ کہیں گے 'اے ہمارے ربّ! تو نے واقعی ہمیں دو(2) دفعہ موت اور دو(2) دفعہ زندگی دے دی' " (غافر:11)۔ اور اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں، "تم اللہ کے ساتھ کفر کا رویّہ کیسے اختیار کرتے ہو، حالانکہ تم بے جان تھے، اس نے تم کو زندگی عطا کی، پھر وہی تمہاری جان سلب کرے گا، پھر وہی تمہیں دوبارہ زندگی عطا کرے گا" (البقرہ:28)۔ یہ آیات پہلی موت کی طرف اشارہ کرتی ہیں جبکہ انسان تخم تھا اپنے باپ کے صلب میں اور اپنی ماں کے رحم میں۔ اللہ نے پھر اُسے زندگی دی اور پھر اس کی موت کا سامان کیا۔ روزِ قیامت وہ پھر ان کو زندہ کرے گا۔ یعنی اس کا حوالہ روزِ قیامت سے قبل روح کی کسی موت سے نہیں، کیونکہ ایسی صورت میں تو تین موتیں ہونی چاہیں۔[1]

جنین میں کب روح پھونکی جاتی ہے؟

جنین کی اِرتقا کے دوسرے مراحل جن کا ذکر اوپر گزر چکا ہے، ان کے متعلّق یہ کہا جاسکتا ہے کہ رحمِ مادر میں اس اِرتقا کا مشاہدہ جدید آلات کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ تاہم جیسا کہ ابنِ اُلقیم نے نشاندہی کی کہ وہ مخصوص وقت جبکہ روح پھونکی جاتی ہے، اُسکا علم صرف

---

[1] ابنِ ابوالعز، جلد2، ص ص۔ 571-562۔

Marfat.com

خالق کی وحی ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔[1] اور ایسا کوئی طریقہ نہیں جس میں رحم کے اندر وقوع پذیر ہونے والے معاملات کے مشاہدے سے یہ معلوم ہو سکے کہ جنین میں کس وقت روح پھونکی گئی ہے۔

اس سوال کا ایک عام جواب یہ ہے کہ نئے آنے والے انسان میں رحم میں 120 دن رہنے کے بعد روح پھونکی جاتی ہے۔ بعض مفسّرین نے لکھا ہے کہ اس بات پر اتفّاق ہے۔[2] تاہم، علما کی اکثریت کا یہ خیال غلط معلوم ہوتا ہے کہ اس سوال کا جواب براہِ راست ابنِ مسعودؓ کی اس حدیث سے متعیّن کیا جا سکتا ہے جس میں نطفہ کا عرصہ 40 دن، اسکے بعد علقے کا 40 دن کا عرصہ اور اسکے بعد مزید مضغے کا 40 دن کا عرصہ بیان ہوا ہے۔

لہٰذا، اس سوال کے صحیح جواب کیلئے یہ ضروری ہے کہ ہم بغور اس سے متعلّق قرآنی آیات اور رسول اللہ ﷺ کی احادیث کا مطالعہ کریں۔ بالخصوص صحیح مسلم میں اس مسئلے سے متعلّقہ کئی احادیث موجود ہیں۔ کتاب القدر میں، امام مسلم یہ حدیث لائے ہیں:

یدخل الملک علی النطفة بعد ماتستقرفی الرحم باربعین اوخمسة واربعین لیلة فیقول یا رب اشقی اوسعید فیکتبان فیقول ای رب اذکر او انثی فیکتبان ویکتب عملہ واثرہ واجلہ ورزقہ ثم تطوی الصحف فلا یزادفیھا ولا ینقص۔

"[حذیفہ ابنِ یمان روایت کرتے ہیں] نطفے[3] کے رحم میں وقوع پذیر ہو جانے کے 40 یا 45 دنوں کے بعد وہ فرشتہ اس پر بھیجا جاتا ہے اور کہتا ہے؛ اے ربّ، کیا یہ بد قسمت ہو گا یا خوش قسمت؟ اور یہ امور لکھے جائیں گے پھر وہ کہتا ہے؛ اے ربّ کیا یہ مرد ہو گا یا

---

[1] وہ کہتے ہیں کہ سائنسدان اور دیگر اشخاص اسی وجہ سے اس معاملے میں اُلجھن کا شکار ہیں۔ شمس الدین ابن اُلقیم، الطبیان فی اقسام القرآن (بیروت: دار الکُتب العلمیہ، 1982) ص۔210۔ ابن اُلقیم خود اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ مرحلہ 120 دن کے بعد آتا ہے، انہوں نے ابنِ مسعودؓ کی اس حدیث کو اس طرح سمجھتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا۔

[2] المضابغی، ص۔98۔

[3] بہر حال اسے پھر بھی نطفہ کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں پھر بھی نطفے کی کچھ خاصیتیں ہوتی ہیں، اس کے باوجود کہ وہ اس کے بعد کے مراحل سے بھی گزر چکا ہوتا ہے۔

Marfat.com

عورت؟ اور یہ لکھ لیا جائیگا۔ اس کے بعد اس کے افعال، زندگی کی طوالت اور رزق لکھا جائیگا۔ پھر یہ اوراق الٹا دیئے جائینگے اور ان میں کچھ اضافہ کمی نہیں ہوگی۔"

اذا مر بالنطفة ثنتان واربعون ليلة بعث الله اليها ملكا فصورها وخلق سمعها وبصرها وجلدها ولحمها وعظامها ثم قال يارب اذكرام انثى فيقضى ربک ماشاء ويكتب الملک ثم يقول يارب اجله فيقول ربک ماشاء ويكتب الملک ثم يقول يارب رزقه فيقضى ربک ماشاء ويكتب الملک ثم يخرج الملک بالصحيفة فى يده فلايزيد على ماامر ولاينقص۔

"جب نطفہ رحم میں 42 راتیں گزار لیتا ہے، تو اللہ اس کے پاس وہ فرشتہ بھیجتا ہے جو اس کی تشکیل کرتا ہے، اس کی سماعت، بصارت، کھال، گوشت اور ہڈیوں کو تخلیق کرتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے، 'اے ربّ، کیا یہ مرد ہوگا یا زن؟' پھر ہمارا ربّ حکم دیتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے اور فرشتہ اسے لکھ دیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے 'اے ربّ اس کا رزق کیا ہوگا؟' پھر تمہارا ربّ حکم دیتا ہے جیسا وہ چاہتا ہے اور فرشتہ اسے لکھ دیتا ہے۔ اسکے بعد فرشتہ یہ نوشتہ اپنے ہاتھ میں لیے چلا جاتا ہے۔ اس میں نہ کچھ اضافہ ہوگا نہ کوئی کمی کہ جو کچھ حکم کر دیا گیا۔"[1]

ان النطفة تقع فى الرحم اربعين ليلة ثم يتصور عليها الملک قال زهير حسبته قال الذى يخلقها فيقول يارب اذكر او انثى فيجعله الله ذكرا او انثى ثم يقول يارب اسوى او غير سوى فيجعله الله سويا او غير سوى ثم يقول يارب ما رزقه ما اجله ما خلقه ثم يجعله الله شقيا او سعيدا۔

"یہ نطفہ 40 راتوں تک رحم میں رہتا ہے۔ پھر اس پر وہ فرشتہ ظاہر ہوتا ہے۔ [زبیر نے کہا میرا خیال ہے کہ انہوں نے کہا، "وہ جو اسے تخلیق کرتا ہے۔"] فرشتہ کہتا ہے، 'اے

---

[1] اس حدیث پر تبصرہ کرتے ہوئے، البر نے لکھا، "یہ بات عام طور پر جانی پہچانی ہے کہ یہ عرصہ (چھٹا ہفتہ [بیالیس (42) دن]) وہ تمام اعضا بننے کے مرحلے organogenesis کے انتہائی عروج کو پہنچ چکا ہوتا ہے جبکہ سماعت کا نظام، بصارت کا نظام، ہڈیاں، گوشت اور جلد بن چکے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد فوراً اعضاء تناسلی خصیہ یا تخمدان (sexual organs) کی تفریق کا مرحلہ ہوتا ہے، جیسا کہ حدیث بتاتی ہے۔" (ص۔74)۔

Marfat.com

ربّ، کیا یہ مرد ہے یا زن؟' پھر اللہ اسے مرد یا زن بنائے گا۔ پھر وہ کہتا ہے 'کیا مکمل ہو گا یا نامکمل [جسمانی طور پر]؟' پھر اللہ اسے حکم دے گا مکمل یا نامکمل پھر وہ فرشتہ کہتا ہے، 'اے ربّ، اس کا رِزق، عمر اور اسکا کردار کیا ہو گا؟' پھر اللہ حکم کریگا کہ یہ خوش قسمت ہو گا یا بد قسمت۔"

ان میں سے کوئی حدیث بھی روح یا انسانی روح کا ذکر نہیں کرتی اور یہ بھی نہیں بتاتی کہ جنین میں کب اسے پھونکا جاتا ہے۔ تاہم ان سب میں صاف طور پر فرشتے کے رحم پر وارد ہونے کا ذکر ہے جو پہلے 40، 45 دنوں یا راتوں کے بعد ہوتا ہے، یہ زیرِ نظر حدیث کی اُس تشریح کو تقویت دیتا ہے جس کے مطابق یہ تینوں مراحل پہلے 40 دنوں میں مکمل ہو جاتے ہیں اور پھر فرشتہ بھیجا جاتا ہے انسان کے ان معاملات کو لکھنے کیلئے {جن کا ذکر کیا گیا}۔

اس معاملے سے متعلق قرآن کی ایک آیت میں آتا ہے،

وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ۔ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ۔ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔

"ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا، پھر اس بوند کو لوتھڑے {زیادہ بہتر ترجمہ 'چپکی یا جڑی ہوئی' (مترجم)} کی شکل دی، پھر لوتھڑے کو بوٹی {زیادہ بہتر ترجمہ 'چبائے ہوئے لوتھڑے نما' (مترجم)} بنا دیا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں، پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کھڑا کیا۔ پس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔" (مومنون:14-12)

قرآن کے کئی مفسّرین کے مطابق جن میں الطبری، ابنِ کثیر اور الرازی شامل ہیں یہ الفاظ کہ "پھر ہم نے اسے ایک نئی تخلیق کی صورت میں پیدا کیا،" سے مراد طبعی جسم میں

Marfat.com

روح کا پھونکا جانا ہے۔[1] اس آیت میں یہ واضح ہے کہ یہ رحم میں پھونکنے کا عمل نطفے کے بعد علقے کے بعد اور مضغے کے بعد اور ہڈیوں پر گوشت چڑھ جانے کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن یہ سوال کہ ٹھیک کس وقت رحم میں روح پھونکنے کا عمل ہوتا ہے یہ اب بھی متعیّن نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم یہ بات واضح ہے کہ یہ عمل تقریباً 40 دنوں کے بعد ہوتا ہے۔

لہٰذا، یہ سوال اب بھی پیچیدہ ہے۔ البر نے اس مسئلے پر مختلف نقطہ ہائے نظر کا خلاصہ یوں پیش کیا،

> وہ قانون دان جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نطفہ، علقہ اور مضغہ کے مراحل 40 دنوں میں تکمیل پاتے ہیں وہ یہ متعیّن نہیں کرتے کہ اس بنتے ہوئے جسم میں روح کب پھونکی جاتی ہے۔ وہ یہ بات نوٹ ضرور کرتے ہیں کہ یقیناً یہ عمل 40 دنوں کے بعد ہوتا ہے، اور جسم کے اعضا کی تشکیل کے بعد ہوتا ہے جن میں جنسی اعضا بھی شامل ہیں۔

ابن ُالقیم نے یہ دلائل دیئے،

> اگر یہ پوچھا جائے کہ جنین میں روح پھونکے جانے سے قبل کیا اس میں شعور اور حرکت موجود ہوتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ یہ حرکت اسی طرح سے ہے جیسے ایک پودے کے بڑھنے میں ہوتی ہے۔ اسکی حرکات اور اسکا شعور عمداً نہیں ہوتا۔ جب جسم میں روح پھونک دی جاتی ہے تو اسکی حرکات اور شعور اِرادے کے تحت ہو جاتے ہیں اور وہ اس روئیدگی کی زندگی میں اضافہ ہوتے ہیں جو اس میں روح پھونکنے سے قبل موجود تھی۔

ابنِ حجر العسقلانی ایک ایسی ہی دلیل پیش کرتے ہین جب وہ بتاتے ہیں کہ کونسے اعضا پہلے بنتے ہیں۔ "جگر،" وہ کہتے ہیں "یہ غذائیت کی جگہ ہے، اور اس مرحلے

---

[1] جیسا کہ، البر، ص۔136۔

Marfat.com

پر افزائش کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ ارادی طور پر حرکات اور شعور کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ اس وقت ہوتا ہے جب روح اور جسم کا مِلاپ ہوتا ہے۔"

یہ بات بہت دلچسپ ہے کہ ابنُ القیم اور ابنِ حجر العسقلانی جیسے جیّد لوگوں نے روح کے جسم سے جڑ جانے کے عمل سے اِرادی طور پر ہونے والی حرکات کے ظاہر ہونے کو مربوط کیا ہے۔

اس[البر کی تحریر] کے پچھلے ابواب میں اسکا(مضغہ اور ہڈیوں کے بننے) کا ذکر ہے کہ بنان (somites)پانچویں ہفتے میں، sclertomes (یا ہڈیوں کے بنانے والے)اور myotomes (پٹھوں کو بنانے والے) میں تقسیم ہو جاتے ہیں، جبکہ چھٹے ہفتے میں جسم کے انگ نمایاں ہونا شروع ہوتے ہیں۔ سر، گردن اور دھڑ(trunk)کے پٹھے آٹھویں ہفتے(56دنوں) میں، جبکہ perineal پٹھے دسویں ہفتے(70دنوں) میں، پہلی اِرادی حرکات چودھویں ہفتے (84دنوں)میں، ممکنہ طور پر شاید آٹھویں ہفتے میں شروع ہو گئے ہوں۔[1]

البتہ ابنِ حجر نے ابنِ عباسؓ سے آئی ہوئی ایک حدیث کا حوالہ دیا ہے جس میں ہے کہ، "نطفے کے چار ماہ دس دن تک رحم میں رہنے کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔" اگر یہ حدیث مُستند ہے تو پھر یہ اس سوال کا ایک صاف اور قطعی جواب ہے۔ یہی رائے سعید ابنِ مسیّبؒ، امام احمد اور شروع کے دور کے دیگر اہلِ علم کی تھی کہ چار مہینے اور دس دن(130 دن) کے بعد روح پھونکی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک بیوہ کیلئے چار ماہ اور دس دن کی عدّت بتائی ہے۔[2] بہر حال ابنِ حجر نے یہ بات واضح نہیں کی کہ یہ بیان رسول

---

[1] البر، ص۔137۔

[2] ابنِ حجر، فتح، جلد13، ص۔322۔

Marfat.com

اللہ ﷺ کا ہے یا ابنِ عباسؓ کا، ابنِ رجب نے اس بیان کا حوالہ دیا ہے لیکن اس طور پر کہ یہ ابنِ عباسؓ کا قول ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کوئی مضبوط روایت نہیں ہے۔[1] اور یہ کہ اس کتاب کے مصنّف نے ذاتی طور پر اپنی استطاعت کے مطابق اس کی تلاش کے باوجود اسے حدیث کی مشہور کتابوں میں نہیں پایا۔[2] اس پر مزید یہ کہ تقریباً وہ سارے اہلِ علم جو اس مسئلے کو زیرِ بحث لائے ہیں کچھ بھی ہو اس حدیث کا ذکر نہیں کرتے، واللہُ اعلم بالصواب۔

کیا روح کا پھونکا جانا انسانی زندگی کی ابتدا کو ظاہر کرتا ہے؟ قرآن اور سُنّت میں کوئی چیز قطعی طور پر ایسی بیان نہیں ہوئی جو اسطرح زندگی کی تخلیق کو روح کے پھونکے جانے پر موقوف کرتی ہو۔ در حقیقت یہ دلیل پیش کی جاسکتی ہے کہ زندگی تو پہلے ہی شروع ہو چکی ہوتی ہے، کیونکہ جنین ایک مرحلے سے اگلے مرحلے میں نشوونما کا سلسلہ جاری رکھتا ہے، اس سے پہلے کہ فرشتہ آکر جنین میں روح پھونکے۔ بہر حال یہ رائے اگر علما کی متفقہ رائے نہیں تو اکثریت کی ضرور ہے کہ نئے انسان کی زندگی کا آغاز روح کے پھونکے جانے سے مربوط ہے۔ محمد نعیم یٰسین اس رائے کے حامی ہیں اور اسکی حمایت میں کئی دلائل دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک اہم مثال وہ انسانوں کے جدِّ اوّل آدم علیہ السلام کی دیتے ہیں۔ آدم مٹی سے بنائے گئے لیکن ان کی تخلیق کا اہم ترین موڑ وہ ہے جب ان میں روح پھونکی گئی۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان،

---

[1] ابنِ رجب، جامی، جلد1، ص۔163۔

[2] ابن السیوطی نے البقرۃ234 کی تشریح میں اس کا ذکر نہیں کیا، حالانکہ انہوں نے دیگر کا ذکر کیا جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس مرحلے پر جنین میں روح پھونکی جاتی ہے۔ دیکھیں جلال الدین السیوطی، الدُّرالمنثور فی التفسیر الماثور (بیروت: دارالمعرفہ، تاریخ ندارد)، جلد1، ص ص۔288-287۔

Marfat.com

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔

''جب تیرے ربّ نے فرشتوں سے کہا 'میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں۔' پھر جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی رُوح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جاؤ۔''(ص:72-71)

یٰسین اس نظریے کی حمایت میں کہ اصل زندگی کی ابتدا روح کے پھونکے جانے کے بعد ہوتی ہے لکھتے ہیں، اس بات پر اتفاق ہے کہ موت اس وقت واقع ہوتی ہے جب روحِ انسانی جسم سے نکل جاتی ہے۔[1]

اس بحث کا نچوڑ یہ ہے کہ باوجود اسکے کہ اس بارے میں کوئی قطعی بات موجود نہیں کہ انسانی زندگی کی ابتدا روح کے پھونکے جانے سے ہوتی ہے، اس بات پر اتفاق رائے موجود ہے اور اس کی حمایت میں قوی دلائل بھی موجود ہیں۔

''اُسے یہ بھی حکم ہوتا ہے کہ چار معاملات کے متعلّق فیصلہ سُنادے: اس کا رزق، اس کی زندگی کی طوالت، اسکے اعمال اور [کیا وہ] غمگین ہوگا [جہنّم میں داخل ہوکر] یا خوش ہوگا [جنّت میں داخل ہوکر]''

فرشتہ انسان سے متعلّق ان تمام معاملات کو لکھ کر محفوظ کرلیتا ہے جبکہ وہ ابھی ایک جنین ہی ہوتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ کے پاس کائنات میں ہونے والے

[1] محمد نعیم یٰسین، ابحاث فقهیه فی قضایا طبیة مُعاصره (اتان، اردن: دار النفائس، 1996)، ص ص۔ 16-15۔

Marfat.com

تمام معاملات کا علم پہلے ہی سے موجود ہے۔ اس علم اور اس کے لکھے جانے کے بارے میں ہم پہلے حدیث نمبر2 میں القدر پر ایمان کے ضمن میں بیان کر چکے ہیں۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ خوراک و معاش کی مقدار طے کر دی گئی ہے اور یہ بھی کہ یہ معاش حلال ذرائع سے حاصل ہو گا یا کہ حرام ذرائع سے۔[1]

کسی شخص کی زندگی کے طے شدہ عرصے کو لکھ کر محفوظ کر دیا جاتا ہے جبکہ وہ ابھی رحمِ مادر ہی میں ہوتا ہے۔ اور ایک شخص کے انفرادی اعمال کو بھی اسی وقت لکھ دیا جاتا ہے۔

پھر فرشتہ یہ بھی لکھ دیتا ہے کہ آیا وہ خوش قسمتوں میں سے ہو گا یا بد قسمتوں میں سے۔ ابنِ حجر کے مطابق، فرشتہ صرف ایک لفظ یا دوسرا لفظ لکھ دیتا ہے۔ یہ تخصیص اس بات پر منحصر ہے کہ کسی کی زندگی کا اختتام کس حالت پر ہو گا، جیسا کہ حدیث کے بقیہ حصے سے واضح ہوتا ہے۔[2] بلاشبہ یہ فیصلہ اللہ کے علم اور انصاف کے مطابق ہوتا ہے۔ جو جنّت کے حقدار ہیں ان کیلئے جنّت مقدّر ہو جاتی ہے کیونکہ اپنی پیدائش کے بعد وہ حق کو تسلیم کریں گے اور اپنی زندگی کو اسی کے مطابق گزاریں گے۔ جن کیلئے جہنّم مقرّر کر دی گئی وہ حق سے انکار کرنے والے ہونگے اور سیدھی راہ پر نہیں چلیں گے۔[3] بے شک اگر اللہ چاہتا تو انسانوں کو اس زندگی سے گزارے بغیر ہی جنّت یا جہنّم میں داخل کر دیتا۔ لیکن یہ زندگی اسلیے ہے کہ ان کے پاس اللہ کے خلاف کوئی حجّت نہ رہے۔ مثال کے طور پر جب انہیں جہنّم میں ڈالا جا رہا ہو وہ یہ دعویٰ نہ کر سکیں کہ وہ حق کو ماننے والے اور اس پر عمل کرنے والے ہوتے۔ اب ان کے اعمال روزِ قیامت ان کے عین سامنے ہونگے اور وہ اپنے بارے میں کوئی جھوٹا دعویٰ نہ کر سکیں گے۔

---

[1] ابنِ حجر، فتح، جلد13، ص۔318۔

[2] ابنِ حجر، فتح، جلد13، ص۔318۔

[3] القاری، جلد1، ص۔151۔

Marfat.com

وہ دراصل کون ہو گا جو خوش ہو گا یا وہ جو ابتر ہو گا؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے ایک نہایت موثر بیان میں ان لوگوں کی ان اقسام کو مزید واضح کر دیا ہے۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ شَقُوْا فَفِی النَّارِ لَهُمْ فِیْهَا زَفِیْرٌ وَّ شَهِیْقٌ۔ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ سُعِدُوْا فَفِی الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَ الْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ؕ عَطَآءً غَیْرَ مَجْذُوْذٍ۔

"جو بدبخت ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے (جہاں گرمی اور پیاس کی شدت سے) وہ ہانپیں گے اور پھنکارے ماریں گے۔ اور اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک کہ زمین و آسمان قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تیرا ربّ کچھ اور چاہے۔ بے شک تیرا ربّ پورا اختیار رکھتا ہے کہ جو چاہے کرے۔ رہے وہ لوگ جو نیک بخت نکلیں گے، تو وہ جنّت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے جب تک زمین و آسمان قائم ہیں، اِلّا یہ کہ تیرا ربّ کچھ اور چاہے۔ ایسی بخشش ان کو ملے گی جس کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہو گا۔" (ہود:106-108)

حدیث کی دوسری روایات میں آتا ہے کہ فرشتہ اللہ سے پوچھے گا، "کیا یہ مرد ہو گا یا زن؟" عبد اللہ ابنِ عمرؓ سے مروی ایک روایت میں یہ سوال بھی شامل ہے: "کیا یہ (حمل) ساقط ہو گا یا نہیں؟" "کیا یہ صرف اکیلا ہو گا یا جڑواں؟"

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ لکھائی فرشتے کی لوح (scroll) میں ہو گی، جب فرشتہ یہ اُمور لکھ چُکا ہو گا تو یہ نوشت تہہ کر دی جائیگی اور اس میں نہ کسی چیز کا اضافہ ہو گا نہ کمی۔

یہ ممکن ہے کہ یہ دو اقسام کی تحاریر ہوں۔ ایک تو فرشتے کی نوشت اور دوسری وہ جو جنین کے ماتھے میں یا دونوں آنکھوں کے درمیان محفوظ کر دی گئی۔ (اس دوسری قسم کا ذکر حدیث میں ملتا ہے جسے ابنِ حبّان نے محفوظ کیا ہے، اور اسکے علاوہ اوروں نے بھی ایسا بیان کیا

Marfat.com

ہے)۔[1] کوئی یہ سوال کر سکتا ہے کہ یہ ساری معلومات ماتھے پر کیسے لکھی جاتی ہیں؟ ابنِ عثیمین اس بات کا جواب یوں دیتے ہیں کہ یہ غیب کے معاملات میں سے ہے اور ایک انسان کو ایسے سوالات سے احتراز کرنا چاہیے۔ بجائے اسکے اُسے یہ کہنا چاہیے کہ میں اللہ اور اسکے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہوں اور یہ نہیں پوچھتا کہ "کیسے؟" اسکے بعد وہ مزید لکھتے ہیں کہ اس دور میں کمپیوٹر کے چپ (computer chip) ہیں جو معلومات کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ کر سکتے ہیں، اسکے باوجود کہ وہ بہت زیادہ چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر انسان ایسی کوئی چیز بنا سکتا ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی قُدرت سے کیا اس سے بہت بہتر چیز کی توقع نہیں رکھنی چاہیے؟ اہم بات یہ ہے کہ یہ بیان رسول اللہ ﷺ کا ہے اور ایک انسان اس کے بارے میں علم نہیں رکھتا کیونکہ یہ وہ بات ہے جو اس کے تجربے میں نہیں آئی، نہ ہی اس کے مشاہدے میں آئی ہے۔ لہٰذا اسے چاہیے کہ اس معاملے میں جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے کہا اس کو مان لے اور اسکے آگے سرِ تسلیم خم کر لے۔ یہ سچے مومنوں کا ایمان ہے کہ رسول اللہ ﷺ سچے ہیں۔[2]

در حقیقت جدید دور کے سائنسدانوں پر یہ بات افشا ہوئی ہے کہ تیسرے مہینے کی شروعات سے جنین کے ماتھے پر کچھ نقوش نمایاں ہونے شروع ہو جاتے ہیں جن کو وہ لنوگو (lanugo) کہتے ہیں۔ سائنسدانوں کا یہ دعویٰ ہے کہ انگلیوں کے نشانوں کی طرح ماتھے کے نقوش بھی ہر انسان کے لیے مُنفرد اور واضح ہوتے ہیں۔[3] تاہم، ظاہر ہے کہ کوئی یقینی طور پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ وہی لکھائی ہے جس کی طرف یہ حدیث اشارہ کرتی ہے۔

---

[1] شعیب الارناؤوط کے مطابق اس حدیث کی اسناد صحیح ہیں۔ دیکھیں شعیب الارناؤوط کے زیرِ حاشیے، امیر علاء الدین الفارسی، الاحسان فی تقریب صحیح ابنِ حبان (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، 1991)، جلد 14، ص ص۔ 55-54

[2] ابنِ عثیمین، شرح ریاض الصالحین، جلد 5، ص ص۔ 342-341۔

[3] دیکھیں البر، ص ص۔ 142-140۔

Marfat.com

آخر میں ابنِ عربی کے نقطۂ نظر کے مطابق، فرشتے کے اس نوشت کو تحریر کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اس میں تبدیلی کی، کچھ کم کرنے یا کچھ اضافہ کرنے کی گُنجائش باقی رہتی ہے وگرنہ اللہ کے لکھے میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔[1] قرونِ اولیٰ کے بعض اہلِ علم کا خیال تھا کہ اس لکھی ہوئی قسمت میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ لیکن، یقیناً اس میں نہیں جو اللہ تعالیٰ نے لوحِ محفوظ میں لکھ دیا ہے۔ اس لیے وہ دعا کرتے تھے، "اے اللہ اگر میرا نام بد قسمتوں میں لکھا گیا ہے، اُسے مٹا دے اور میرا نام قسمت والوں میں لکھ دے۔" یہ دعا اس لکھنے کی طرف اشارہ کرتی ہے جو کہ فرشتہ لکھتا ہے جبکہ جنین ابھی رحمِ مادر ہی میں ہوتا ہے نہ کہ اس لکھنے کی طرف جو لوحِ محفوظ میں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

اُن کا مسئلہ جو یہ رائے رکھتے ہیں کہ یہ تمام سلسلہ 120 دنوں پر مُحیط ہوتا ہے۔

وہ اہلِ علم جو یہ سمجھتے ہیں کہ جنین 40 دن تک نطفہ کی صورت میں رہنے کے بعد مزید 40 دن علقہ اور اسکے بعد 40 دن مضغہ کی صورت میں رہتا ہے، ان کے لیے اس حدیث کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کی مطابقت قائم کرنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے کیونکہ اس حدیث کے مطابق تقریباً 40 دنوں کے بعد فرشتہ رحم پر بھیجا جاتا ہے اور وہ اس جنین سے متعلّق خاص خاص باتوں کو لکھ کر محفوظ کر لیتا ہے۔ ایسی ہی دیگر احادیث اوپر نوٹ کی گئی ہیں، اسی نہج کی ایک اور حدیث یہ ہے،

اذا مر بالنطفة ثنتان واربعون ليلة بعث اللّٰه اليها ملكا فصورها وخلق سمعها وبصرها وجلدها ولحمها وعظامها ثم قال يارب اذكر ام انثى فيقضى ربک ماشاء ويكتب الملک ثم يقول يارب اجله فيقول ربک ماشاء ويكتب الملک ثم يقول يارب رزقة فيقضى ربک ماشاء

---

[1] ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص۔ 321۔

Marfat.com

ویکتب الملک ثم یخرج الملک بالصحیفۃ فی یدہ فلا یزید علی ما امر ولا ینقص۔

"جب نطفے پر رحم میں 40 راتیں گزر جاتی ہیں، اللہ اس پر ایک فرشتہ بھیجتا ہے جو اس کی تشکیل کرتا ہے اور اسکی سماعت، بصارت، کھال، گوشت اور ہڈیاں تخلیق کرتا ہے، پھر وہ کہتا ہے، "اے ربّ، کیا یہ مرد ہے یا زن؟" پھر تمہارا ربّ حکم کرتا ہے جو کچھ وہ چاہتا ہے اور فرشتہ اسے محفوظ کرلیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے، 'اے ربّ، اس کی زندگی کتنی طویل ہے؟' پھر تمہارا ربّ کہتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور فرشتہ اُسے محفوظ کرلیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے، 'اے ربّ اس کا رِزق کیا ہو گا؟' پھر تمہارا ربّ حکم کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے اور فرشتہ اسے محفوظ کرلیتا ہے۔ پھر فرشتہ اپنے ہاتھوں میں یہ نوشت لیے رخصت ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ کوئی چیز شامل ہو گی جسکا حکم ہو چکا ہے اور نہ ہی کوئی کمی کی جائیگی۔"

{یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حدیث کے آخر میں جب یہ کہا گیا کہ نہ کوئی چیز اس میں شامل کی جائیگی اور نہ ہی کوئی کمی کی جائیگی اس کے ساتھ یہ شرط ہے کہ جس کا فیصلہ کیا جا چکا ہے، پھر حدیث کے پہلے حصے میں یہ نوٹ کیجئے کہ جہاں عمر کا ذکر ہے وہاں یقضی اس نے (فیصلہ کر دیا) کی بجائے لفظ یقول (اس نے کہہ دیا) آیا ہے جس سے شاید یہ ظاہر کرنا مراد ہو کہ یہ عمر ایک قطعی متعیّن عرصہ نہیں۔ کم از کم انبیا کے معاملے میں عمر کے متعین شدہ عرصے میں کمی اور زیادہ کی مثالیں موجود ہیں۔ البخاری میں ابو ہریرہؓ کی سند سے آئی ہوئی حدیث میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے موت کے فرشتے کو جبکہ وہ اُن کی روح قبض کرنے آیا تھا تھپڑ مار کر واپس بھیج دیا اور جب اللہ تعالیٰ نے اُسے اس ہدایت کے ساتھ واپس بھیجا کہ موسیٰ علیہ السلام سے کہے کہ وہ ایک بَیل پر اپنا ہاتھ رکھیں اور اس کے نیچے جتنے بال آئیں موسیٰ علیہ السلام کی عمر اتنے سال بڑھا دی جائے گی۔ جس پر موسیٰ علیہ السلام نے موت کے فرشتے کو اپنی روح قبض کرنے کی اجازت دی۔ ابو ہریرہؓ ہی سے آئی ہوئی الترمذی کی ایک حدیث میں آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ آتا ہے کہ جب انہیں ان کی نسل میں آنے

Marfat.com

والوں کا دیدار کرایا گیا تو وہ داؤد علیہ السلام کو دیکھنے کے بعد انہیں اپنی عمر کے 40 سال دینے کو راضی ہو گئے تھے اور اسی کے مطابق اُن کی عمر میں 40 سال کی کمی کر دی گئی تھی، اس حدیث میں ''النقضی'' کا لفظ آیا ہے جس کے بارے میں اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ فیصلے کو ظاہر کرتا ہے جو کہ ایک قطعی صورت ہے اور لفظِ یقول سے زیادہ زور دار ہے جس کا استعمال اوپر درج کی گئی حدیث میں عمر کے حوالے سے آیا ہے۔ واللہُ اعلم بالصواب۔ (مترجم)}۔

ان مختلف احادیث میں دی گئی معلومات میں مطابقت تلاش کرنے کے سلسلے میں مختلف تعبیریں اختیار کی گئی ہیں۔ مثلاً ایک تعبیر یہ ہے کہ 40 دن کے بعد فرشتہ نطفے کو جبکہ وہ علقہ بنتا ہے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیتا ہے پھر ان مختلف حصوں سے گوشت، ہڈیاں وغیرہ بناتا ہے۔ لہٰذا، ان کے بننے سے قبل ہی اسی موقع پر یہ مُختص کر دیئے جاتے ہیں۔ ابنِ رجب کہتے ہیں کہ یہ تعبیر اوپر بیان کی گئی حدیث کے صاف اور سیدھے معنوں کے خلاف جاتی ہے جس کے مطابق یہ سب کچھ 42 دن مکمل ہونے پر ہی ہو جاتا ہے۔ لہٰذا ایسی تفسیر ناقابلِ قبول ہے۔ ابنِ رجب مزید لکھتے ہیں کہ یہ تفسیر جنین سے متعلّق ان حقائق کے بھی خلاف جاتی ہے جس کو اُن کے دور کے اطبّا دریافت کر چکے تھے۔[1]

ابنِ الصلاح نے اوپر بیان کی گئی تفسیر پیش کی اور انہوں نے ایک اور تفسیر بھی پیش کی۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ حصہ جو مختلف مراحل یعنی نطفہ، علقہ اور مضغہ کو بیان کرتا ہے اضافی یا مداخلتی ہے۔ لہٰذا، ترجمہ کچھ یوں ہو گا: ''یقیناً تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کے پیٹ میں جمع کیا جاتا ہے چالیس دن تک (پھر وہ ایک چپکی ہوئی چیز ہوتا ہے اس عرصے میں۔ پھر وہ چبائے ہوئے لوتھڑے کی طرح ہوتا ہے اس عرصے میں)۔ اسکے بعد اس پر ایک فرشتہ بھیجا جاتا

---

[1] ابنِ رجب، جامی، ص ص۔159-158۔ اسے بھی دیکھیں، ابنُ القیم، الطیبان، ص۔216، جو یہ استدلال کرتے ہیں کہ ایسے دو مواقع ہیں جن پر فرشتہ وارد ہوتا ہے۔ پہلا موقع وہ ہے جبکہ جنین کی طبعی ساخت سے متعلّق جو حکم ہوتا ہے وہ کسی پر ظاہر نہیں ہوتا اور پوشیدہ رہتا ہے۔ بعد کے موقع پر جبکہ 120 دن گزر جانے کے بعد دوسرا حکم نازل ہوتا ہے جس کے اثرات جنین پر نمایاں ہوتے ہیں۔ ایضاً، یہ استدلال معقول معلوم نہیں ہوتا۔

Marfat.com

ہے جو اس میں روح پھونکتا ہے۔ اور اسے چار چیزوں کا حکم دیا جاتا ہے۔۔۔" اگر یہ مداخلتی ہے تو ایسی صورت میں اگر ان کو جملے سے حذف بھی کر دیا جائے تو جملے کے معنوں میں تبدیلی واقع نہیں ہو گی۔ لہٰذا جب ان جملوں کو حذف کر دیا جائے تو حدیث کچھ یوں ہو جائے گی "یقیناً تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کے پیٹ میں 40 دن تک جمع کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ فرشتہ بھیجا جاتا ہے اور وہ اس میں روح پھونکتا ہے۔ اور اسے چار چیزوں کا حکم بھی دیا جاتا ہے۔۔۔" کیونکہ یہ جملے مداخلتی ہیں اس کے حقیقی معنی یہ ہونگے کہ فرشتہ پہلے 40 دن گزرنے کے بعد بھیجا جاتا ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں اور اس مضمون کی دوسری احادیث میں کوئی اختلاف نہیں۔ ابنِ الصلاح مزید لکھتے ہیں کہ عربی زبان میں اس قسم کا اسلوبِ عام ہے حتٰی کہ قرآن میں بھی پایا جاتا ہے۔[1]

شاید یہ دلیل اس سے پہلے پیش کی گئی دلیل سے زیادہ مضبوط ہے۔ تاہم، جملوں کے بارے میں بنیادی قانون یہ ہے کہ وہ اضافی نوعیّت کے نہیں ہوتے جب تک کہ یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہی صورت ہے۔ مزید یہ کہ قرآن میں جب بھی اضافی جملے استعمال ہوئے ہیں ان کے بارے میں کوئی ابہام نہیں کہ وہ اضافی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی زبان بھی بہت صاف تھی۔ ایسا تسلیم کرنا مشکل ہو گا کہ وہ ایسا بیان دیں جو بہت آسانی سے غلط معنوں میں لیا جاسکتا ہو، یہ ماننا بھی بہت مشکل ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے (اس مخصوص حدیث میں) بیان میں ایسا کچھ تھا جو یہ ظاہر کرے کہ یہ جملے وضاحتی نوعیّت کے ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی یہ بات مان لے کہ یہ سارے مراحل پہلے 40 دنوں میں مکمل ہو جاتے ہیں تو اس تعبیر کا سہارا لینے کی وجہ نہیں رہتی۔

---

[1] عثمان ابنُ الصّلاح، فتاوی، ابنُ الصّلاح (درا الشریف لل نشر والتوزی)، ص ص۔ 42-41۔

Marfat.com

یہ رائے رکھنے والے اہلِ علم بھی ہیں کہ مختلف جنینوں کیلئے اس عرصے کی طوالت مختلف ہوتی ہے۔ واللہُ اعلم بالصواب۔[1]

"میں اللہ کی قسم کھاتا ہوں جس کے سوا کوئی خدا نہیں، یقیناً، تم میں سے کوئی ضرور اہلِ جنّت والے اعمال کرے گا اس وقت تک کہ اسکے اور جنّت کے درمیان ایک ہاتھ کا ہی فاصلہ رہ جائے گا اور پھر جو کچھ اُسکے لیے لکھا جا چکا ہے اپنا کام دکھائے گا اور وہ کوئی ایسے کام کرے گا جو اہلِ نار کے کام ہوتے ہیں اور جہنّم میں داخل ہو جائے گا....."

حدیث کے اس حصہ کے متعلّق تنازعہ

حدیث کے اس حصے کے متعلّق کچھ تنازعہ ہے۔ یہ تنازعہ اس وجہ سے ہے کہ اس حدیث کے بعض راویوں نے حدیث کے اس حصے کو عبد اللہ ابنِ مسعودؓ کا قول قرار دیا ہے نہ کہ رسول اللہ ﷺ کا۔ الطحاوی کے مطابق، اس بات سے قطع نظر کہ یہ قول ابنِ مسعودؓ کا ہے یا رسول اللہ ﷺ کا، یہ ایک درست اور سچّا قول ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ابنِ مسعودؓ اپنی صوابدید

---

[1] الحیتمی، ص۔97۔

Marfat.com

کے مطابق ایسا بیان نہیں دے سکتے۔ یہ بات ان تک ضرور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے ہی پہنچی ہو نگی۔ لہٰذا، الطحاوی کی رائے میں یہ ایک بے کار کا تنازعہ ہے۔ اور دونوں میں سے کسی بھی صورت میں یہ بیان درست ہے اور اس پر ایمان رکھنا ضروری ہے۔[1]

"میں اللہ کی قسم کھاتا ہون جس کے سوا کوئی ربّ / الٰہ نہیں"

اس بیان کی صداقت پر کئی پہلو دلالت کرتے ہیں۔ جن میں سے پہلا، اللہ کی قسم کھانا ہے۔ اس کے بعد لفظ، 'اِنَّ' کی موجودگی۔ تیسرے حرف، 'لام' کی موجودگی جو کہ لفظ لیعمل میں شامل ہے یعنی "یقیناً کرے گا" ان ساری چیزوں کی موجودگی آگے آنے والے جملے کی حقّانیت اور صداقت پر زور دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی اس انداز سے گفتگو نہیں کرے گا دراں حالیکہ اُسے ایسا کرنے کی ضرورت محسوس ہو۔ یہاں اس کی ضرورت اس لیے تھی کیونکہ جو کچھ حدیث کے بقیہ حصے میں بیان ہوا ہے ممکنہ طور پر کوئی اس کو ماننے سے انکار کر سکتا تھا یا اس کے بارے میں کوئی عجیب تصوّر قائم کر سکتا تھا۔ بقیہ حصے میں یہ ہے کہ کوئی سالہا سال تک ایسے شخص کی طرح کے اعمال کرتا ہے جو ظاہری طور پر اہلِ جنّت کے اعمال ہیں لیکن اس کا انجام جہنّم میں داخلے کی صورت میں ہوتا ہے۔ دوسری جانب ایک اور شخص سالہا سال ایسے اعمال کرتا ہے جو کہ اسے نارِ جہنّم میں لے جانے والے ہوں لیکن انجام جنّت میں داخلے کی صورت میں ہوتا ہے۔ یقیناً یہ بات چونکا دینے والی اور غیر متوقع ہے۔ لہٰذا، رسول اللہ ﷺ اس بیان کو ان الفاظ سے اور اس انداز سے شروع کرتے ہیں، تاکہ اس بات پر زور دیا جائے کہ بعض اشخاص کے ساتھ ایسا معاملہ ہو سکتا ہے۔

---

[1] احمد الطحاوی، شرح مشکل الاثر (بیروت: مؤسسات الرسالہ، 1994)، جلد 9، ص۔485۔

Marfat.com

''یقیناً، تم میں سے کوئی ضرور اہلِ جنّت کے اعمال کرے گا اس وقت تک کہ اسکے اور جنّت کے درمیان ایک ہاتھ کا ہی فاصلہ رہ جائے گا پھر جو کچھ اسکے لیے لکھا جاچکا ہے اپنا کام دکھائے گا اور وہ کوئی ایسے کام کرے گا جو اہلِ نار کے کام ہوتے ہیں اور جہنّم میں داخل ہو جائیگا''

اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ ایک ایسے شخص کے متعلّق بیان فرمارہے ہیں کہ وہ ایسے اعمال تقریباً ساری زندگی کرتا رہے گا جو اسے جنّت کی جانب لے جانے والے ہونگے۔ ابو ہریرہؓ سے مروی مسند احمد کی ایک روایت میں یہ ہے کہ وہ ایسے اعمال 70 سال تک کرتا رہے گا۔ پھر اپنی موت سے کچھ عرصے قبل، جو اسکے لیے متعیّن کر دیا گیا ہے جبکہ وہ ایک جنین تھا{اسکے مطابق} وہ اپنے طرزِ عمل کو تبدیل کرے گا۔ وہ جنّت میں لے جانے والے اعمال کو چھوڑ دے گا، اور ان کے بجائے جہنّم کی آگ میں لے جانے والے اعمال شروع کر دے گا۔ وہ جنّت میں داخلے کے بہت قریب تھا، جیسے اسکے اور جنّت کے درمیان صرف اسکی موت رہ گئی ہو۔ لیکن وہ اپنے اعمال کو جاری نہ رکھ سکا۔ وہ صبر واِستقلال سے اہلِ جنّت والے اعمال کو جاری نہ رکھ سکا۔ وہ اپنی موت سے قبل بدل گیا اور اہلِ نار میں شامل ہو گیا۔

یہ حدیث کسی شخص سے متعلّق فیصلے کے ایک اہم پہلو کی طرف نشاندہی کرتی ہے۔ وہ یہ کہ ایک شخص کے متعلّق فیصلہ اس کی موت سے قبل اسکے ایمان واعمال کے مطابق کیا جائیگا۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے،

ان العبد ليعمل عمل اهل النار وانه من اهل الجنة ويعمل عمل اهل الجنة وانه من اهل النار وانما الاعمال بالخواتيم۔

Marfat.com

"ایک شخص اہلِ نار والے اعمال کرتا ہے حالانکہ وہ اہلِ جنّت میں سے ہوتا ہے۔ اور ایک شخص اہلِ جنّت کے اعمال کرتا ہے اور وہ اہلِ نار میں سے ہے اور یقیناً اعمال کا دارومدار ان کے اختتام پر ہے۔" (البخاری)

درحقیقت یہ ایک لرزا دینے والی سوچ ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ ہر مسلمان کو ہر دم چوکنا رہنا ہوگا، اس بات کو یقینی بنانے کیلئے کہ وہ ہمہ وقت سیدھی راہ پر ہی رہے۔ وہ اپنے ان اعمال سے مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ سکتا کہ جو وہ زمانۂ حال میں کر رہا ہے، کیونکہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ وہ اپنی راہ تبدیل کرلے اور ایسے اعمال کرنے شروع کردے جو کہ اہلِ نار کے اعمال ہوتے ہیں۔ لہٰذا، اسے ہر وقت چوکنا رہنا ہوگا۔ اسے ہر وقت ان اعمال کی جستجو کرنا ہوگی جو اس کے ایمان کو مُستحکم کرنے والے، اسے تازہ دم کرنے والے اور اسے مضبوط رکھنے والے ہوں۔ اور اسے ہمیشہ ان راستوں سے دور رہنا ہوگا جو اسکے ایمان کو کمزور کرنے اور نقصان پہنچانے والے ہوں۔ یہ اسلیے کہ اسے خبر نہیں کہ یہ راستے اسے کہاں پہنچادیں اور ممکنہ طور پر اسکی موت بدبختی کی حالت میں ہوسکتی ہے۔

کسی انسان کے دل کا بدل جانا ایک بہت آسان چیز ہے۔ عربی کا لفظ قلب اس حقیقت کا آئینہ دار ہے کہ یہ مکمل طور پر ایک جانب سے دوسری جانب اپنا رُخ تبدیل کرسکتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا،

انما سمی القلب من تقلبہ انما مثل القلب کمثل ریشۃ معلقۃ فی اصل شجرۃ یقلبھا الریح ظھرا لبطن۔

"یہ صرف اسی وجہ سے قلب کہلاتا ہے کیونکہ یہ بدل سکتا ہے قلب کی مثال ایسی ہے کہ ایک درخت کے تنے سے کوئی پتا لٹک رہا ہو جو ہوا سے اوپر نیچے ہو رہا ہو۔"[1]

---

[1] اسے احمد نے محفوظ کیا۔ الاعراقی کے مطابق اس کی اسناد حسن ہیں۔ [جیسا کہ، احمد البنّا، الفتح الرّبانی لی ترتیب مسند الامام احمد ابنِ حنبل الشیبانی (قاہرہ: دارالحدیث، تاریخ ندارد)، جلد 14، ص ص۔290-289] احمد اور ابنِ ماجہ نے ایک اور حدیث قلمبند کی

Marfat.com

رسول اللہ ﷺ کی ایک اور حدیث ہے جو یہ بتاتی ہے کہ کس آسانی سے دل بدل جایا کرتے ہیں اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ خود بھی دل کو ثابت قدم رکھنے کی دعا کیا کرتے تھے۔ امام الترمذی نے درجِ ذیل حدیث محفوظ کی ہے،

كان رسول اللّٰہ صلى اللّٰہ عليه وسلم يكثر ان يقول يا مقلب القلوب ثبت قلبى على دينک فقلت يارسول اللّٰہ آمنا بک وبما جئت به فهل تخاف علينا قال نعم ان القلوب بين اصبعين من اصابع اللّٰہ يقلبها كيف يشاء۔

رسول اللہ ﷺ کثرت سے کہا کرتے تھے۔ ''اے دلوں کو پھیرنے والے، میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔'' صحابہ نے کہا، ''یارسول اللہ ﷺ ہم آپ پر ایمان لائے ہیں اور اس پر جو آپ لائے ہیں۔ کیا آپ ہمارے متعلّق بھی ڈرتے ہیں؟'' آپ نے جواب دیا ''ہاں یقیناً، دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہوتے ہیں اور وہ ان کو موڑ دیتا ہے جس جانب وہ چاہتا ہے۔''[1]

یہ بات نوٹ کیجئے کہ رسول اللہ ﷺ نے رحم میں تخلیق سے متعلّق اس حدیث میں دو طرح کے معاملات کو بیان کیا، جب کوئی اچھے سے بُرا یا بُرے سے اچھا بن جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان عمومی حالتوں کی بات نہیں کی جن میں کوئی ساری عمر اچھا رہتا ہے یا ساری عمر بُرا ہی رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا مقصد یہاں تمام مثالوں کو بیان کرنا نہیں تھا بلکہ مقصد کسی شخص کی لکھی ہوئی تقدیر کے بارے میں اس نکتے کو واضح کرنا تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ایک شخص کے کیا اعمال تھے، موت سے قبل وہ ایسے اعمال کرے گا جو اس سے مطابقت

ہے جو کہ اوپر بیان کی گئی حدیث کے آخری حصے کو معاونت فراہم کرتی ہے۔ الالبانی نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ دیکھیں الالبانی کے زیریں حاشیے، التبریزی، جلد 1، ص۔ 37۔

[1] اسے الترمذی نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامی، جلد 2، ص۔ 1323۔ صحیح مسلم میں اس حدیث کے آخری حصہ سے مشابہ روایت موجود ہے۔

Marfat.com

رکھتے ہونگے، یعنی جو کچھ اس کیلئے لکھ دیا گیا ہے کہ وہ خوش بخت لوگوں میں ہے یا بدبخت لوگوں میں۔

بظاہر بعض مفسّرین یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ حدیث ان لوگوں کے متعلّق ہے جو کچھ عرصے تک اسلام پر عمل کرتے رہے اور کسی مرحلے پر مرتد ہوگئے۔ ابنِ حجر کے مطابق اس مفروضے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جہنّم کی آگ میں داخلے کی جو صورت بیان کی گئی ہے اس کے معنی ضرور ہمیشہ کیلئے جہنّم رسید ہونے کے نہیں۔ دوسرے لفظوں میں ممکنہ طور پر یہ حدیث مسلمانوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو ایک عرصے تک اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرتے رہے، اسکے بعد انہوں نے اپنی راہ تبدیل کی اور کئی گناہوں کے مُرتکب ہوئے، لیکن وہ دائرۂ اسلام کے اندر رہے، لہٰذا، وہ اہلِ نار میں سے تو ہوں گے لیکن اللہ کے فضل کے سبب وہ ہمیشہ وہاں نہیں رہیں گے۔ اسلیے یہ حدیث گناہوں کے ارتکاب کے بارے میں ایک تنبیہ ہے اور اسلام سے مکمل اخراج کے بارے میں بھی ایک تنبیہ ہے۔[1]

حدیث کے اس حصے کے بارے میں ایک غلط فہمی

ابنِ عثیمین کے مطابق، اس حدیث کے معنی یہ ہیں، ایک شخص اہلِ جنّت والے اعمال کرتا ہے "لوگوں کے خیال کے مطابق" یعنی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک نیک انسان ہے جبکہ اسکے دل میں بدی ہوتی ہے اور وہ اہلِ نار میں سے ہوتا ہے۔ ان کی اس سوچ کی بنیاد صحیح البخاری کی ایک حدیث ہے جس میں ہے کہ ایک شخص جو مسلمانوں کے ہمراہ بے جگری سے جنگ کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ وہ اہلِ نار میں سے ہے۔ اسکے بعد ایک شخص اس کا تعاقُب کرتا ہے اور اُسے خودکشی کرتا ہوا پاتا ہے۔ تو رسول اللہ ﷺ اس موقع

---

[1] ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص ص۔326-327۔

Marfat.com

پر ارشاد فرماتے ہیں" ایک شخص ایسے اعمال کرتا ہے جو لوگوں کی نظر میں اہلِ جنّت کے اعمال ہوتے ہیں۔"[1]

بہر حال یہ حدیث زیرِ مطالعہ حدیث سے کوئی تعلّق نہیں رکھتی زیرِ مطالعہ حدیث کا تعلّق تقدیر سے ہے اور اس سے ہے کہ ایک انسان کیلئے جو کچھ لکھ دیا گیا وہ ہو کر رہے گا۔ ایسے لوگ ہیں جن کے بارے میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ وہ بدبخت لوگ ہیں۔ تو ایسے لوگ اپنی ساری زندگی نیک کاموں میں گزارتے ہیں۔ یقیناً نیک اعمال، دکھانے کیلئے نہیں اور منافقت میں نہیں کرتے۔ لہٰذا یہ حدیث ان لوگوں کے بارے میں نہیں جو دکھاوے کیلئے نیک اعمال کرتے ہیں جبکہ انکے دلوں میں بدنیّتی موجود ہوتی ہے۔ یہ حدیث ان لوگوں کے بارے میں ہے جو اپنی زندگی کے اختتام سے قبل اپنی راہ تبدیل کر لیتے ہیں۔

مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے زیرِ مطالعہ حدیث میں اس کی مخالف صورت کا بھی ذکر کیا (آپ ﷺ نے ایسا اس حدیث میں نہیں کہا جسکا حوالہ ابنِ عثیمین دیتے ہیں)۔ ظاہر ہے، ایسی صورت ہو نہیں سکتی کہ ایک شخص اہلِ نار کے اعمال کرتا رہے اور لوگ بھی اسے ایسا ہی سمجھتے رہیں جبکہ دراصل وہ اپنے دل میں کوئی نیک انسان ہو اور اہلِ جنّت میں سے ہو۔

یہ بہت اہم ہے کہ ہم اس حدیث کو اچھی طرح سمجھ لیں کیونکہ اس کے متعلّق ابنِ عثیمین کا غلط فہمی کے نتائج بہت پُر پیچ اور مختلف ہیں۔

---

[1] دیکھیں ابنِ عثیمین، شرح ریاض الصالحین، جلد 5، ص ص۔ 343-342۔

Marfat.com

"اور یقیناً، تم میں سے کوئی ضرور اہلِ نار کے اعمال کرے گا یہاں تک کہ اسکے اور جہنّم کے درمیان ایک ہاتھ کا فاصلہ رہ جائے گا پھر جو کچھ اسکے لیے لکھ دیا گیا ہے، اپنا اثر دکھائے گا اور وہ اہلِ جنّت والے اعمال کرے گا اور اس میں داخل ہو گا۔"

یہ صورتِ حال پہلے بیان کی گئی صورتِ حال کا عکس ہے۔ ابنِ دقیق العید نشاندہی کرتے ہیں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی بیش بہا رحمت کے سبب ہے کہ پہلے بیان کی گئی صورت بہت کم جبکہ بعد والی صورتِ حال اکثر واقع ہوتی رہتی ہے۔[1] یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، کہ وہ ان لوگوں کی ہدایت فرماتے ہیں جو اسکی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اگر کوئی نیک اعمال کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ مستقل اس کی ہدایت کا سامان کرتے رہتے ہیں۔ اُسکی مدد فرماتے ہیں اور اسکی خطاؤں سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔ صرف اس صورت میں ہی اللہ تعالیٰ کسی کو کفر اور جہنّم کی آگ تک لے جاتے ہیں جب کسی شخص کے دل کی حالت مکمل طور پر بدل جاتی ہے۔ دوسری جانب ایسی بے شمار مثالیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کو نارِ جہنّم سے بچالیا اور اسلام کی طرف اسکی رہنمائی کی۔ وہ اہلِ نار کے اعمال کر رہا تھا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے وہ اب اہلِ جنّت میں سے ہو گیا۔ در حقیقت تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین جنہوں نے اسلام کی دعوت پہنچنے پر اسے قبول کیا اس قبیل ہی سے ہیں۔

حدیث کا یہ حصہ اُن لوگوں کیلئے باعثِ اُمید ہے جو آج گناہوں کا اِرتکاب کر رہے ہیں، اس ادراک کے ساتھ کہ وہ غلط کار ہیں لیکن ابھی تک وہ کسی طرح اپنے آپ کو اس حالت سے نکال نہیں سکے۔ ایسا شخص اگر اپنے آپ کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کرتا رہے، انشاء

---

[1] محمد ابنِ دقیق العید، شرح الاربعین حدیث النوویہ (اشاعت سے متعلق کوئی معلومات موجود نہیں)۔

Marfat.com

اللہ، بالآخر، ایک روز وہ راہِ راست کو پالے گا۔ جب وہ ایسا کرے گا وہ اہلِ جنّت کے اعمال کرنا شروع کر دے گا اور اسی حالت میں وفات پائے گا۔ یہ ایک اور بڑا انعام، فضل اور اللہ کی طرف سے ایک موقع ہے۔ جو آج گناہ کی زندگی گزار رہے ہیں انہیں اس حقیقت پر غور کرنا چاہیے اور اپنی راہوں کو اس وقت سے پہلے تبدیل کر لینا چاہیے کہ جب موت انہیں آلے اور وہ اُس وقت تک اہلِ نار کے اعمال کرنے ہی میں مصروف ہوں۔

چند متعلّقہ فقہی معاملات

اِسقاطِ حمل کا سوال

یہ حدیث رحمِ مادر میں انسان کی تخلیق کو بیان کرتی ہے۔ یہ اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ انسان کی ابتدا حمل کے کچھ عرصے کے بعد روح پھونکنے کے عمل سے ہو جاتی ہے جو کہ اصل پیدائش سے ایک لمبے عرصے قبل ہوتا ہے۔ اس میں اسقاطِ حمل اور اسلام میں اسکے قانونی پہلو کے سوال سے متعلّق کئی مضمرات ہیں۔ جیسا کہ اوپر نوٹ کیا جا چکا ہے، تاہم عمومی طور پر اس رائے کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ جنین میں روح پھونکے جانے کا عمل 120 دن کے بعد ہوتا ہے۔ اس رائے کا اسقاطِ حمل کے متعلّق فقہا کے نقطۂ نظر پر گہرا اثر ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس بات پر مکمل اتفّاق ہے کہ 120 دن کے بعد اسقاطِ حمل حرام ہے دراں حالیکہ کسی اشد ضرورت کے تحت ہو۔ 120 دن سے قبل اسقاطِ حمل کے سوال پر کچھ مختلف آراء موجود ہیں۔

{گو کہ مُصنّف "abortion" یا اسقاطِ حمل کی اصطلاح کا استعمال کرتے ہیں دراصل اُن کی مراد induced abortion یا voluntarily chosen abortion ہے جس کا درست ترجمہ انتخابی یا ارادی اسقاطِ حمل ہو سکتا ہے۔ (مترجم)}

Marfat.com

Contemporary Jurisprudence Referral Journal نامی جریدے
میں شائع ہونے والے ایک مقالے
Rule on Abortion which Take Place Before Completion of"
one Hundred and Twenty Days of Pregnancy" سے آگے بیان کی گئی
معلومات لی گئی ہیں، اس سے مختلف صورت میں ایسا نہ ہونے کی نشاندہی کی گئی ہے۔[1]

جنین میں روح پھونکے جانے سے قبل یا دوسرے الفاظ میں حمل کی ابتدا سے 120 دن مکمل ہونے سے قبل اسقاطِ حمل کے سوال پر احناف کے ہاں بچے کے قتل کے لیے کوئی غُرایا قصاص لاگو نہیں ہوگا، دراں حالیکہ جنین پر انسانی نقوش ظاہر ہوگئے ہوں۔ اگر کوئی نقوش ظاہر نہیں ہوئے تو کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ {ڈاکٹر عائشہ
ونسلو (Dr.Winslow) جو Doctor of Nursing Practice کی سند رکھتی ہیں
انہوں نے مترجم سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ 120 دن کے بعد بھی اگر جنین پر انسانی نقوش واضح نہیں ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا خاتمہ کئی ہفتے قبل ہو چکا ہے۔ انہوں نے اس کے ثبوت کے طور پر مترجم کو کئی تصاویر بھی دکھائیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ 120 دن سے کئی ہفتے قبل ہی انسانی نقوش واضح ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ (مترجم)۔} حنفی مکتبہ فکر میں ایک اور رائے یہ بھی ہے کہ اسقاطِ حمل کا اِرتکاب کرنے والا (چاہے وہ باپ ہو ماں ہو یا اور کوئی) گناہگار تصوّر کیا جائیگا۔ جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں دلیل لاتے ہیں کہ اس کی مطابقت اس معاملے سے ہے جس میں ایک مُحرم (حج یا عمرے کیلئے

---

[1] "ایسے اسقاطِ حمل سے متعلق قوانین جو کہ حمل کے 120 دن مکمل ہونے سے قبل ہوتا ہے،" Contemporary Jurisprudence Research Journal (15th Edition, 4th Year, Oct-Nov-Dec,1992), pp. 57-59۔ اس سلسلے میں متعلقہ حوالے اس مقالے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ اسقاطِ حمل سے متعلق ایک عمدہ بحث دیکھی جاسکتی ہے۔ ام کلثوم الخطیب، قاضیہ تحدید النسل فی الشریعہ الاسلامیہ (جدہ: الدار السعودیہ، 1984)، ص ص۔ 180-149۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی ہیں کہ حمل کے دوران حتٰی کہ پہلے 40 دنوں کے دوران بھی اسقاطِ حمل کی اجازت نہیں — سوائے انتہائی ضرورت کے تحت۔

Marfat.com

جو احرام کی حالت میں آگیا) اگر کسی جنگلی جانور (wild game) کا ایک انڈہ توڑ دیتا ہے تو اس عمل کی پاداش میں اس پر کفّارہ واجب ہو گا، کیونکہ یہ انڈہ جنگلی جانور کی ابتدائی صورت ہے، اس رائے کے مطابق جنین جس پر ابھی انسانی نقوش واضح نہ بھی ہوئے ہوں وہ بھی تخلیق کی ابتدائی حالت ہے، کہ اگر اسے افزائش کے لیے چھوڑ دیا جاتا تو وہ ایک ذی روح کی شکل اختیار کر لیتا۔ اور اس وجہ سے وہ جو ایسا اِسقاط کرتا ہے یا اس میں ملوّث ہوتا ہے ایک گنہگار ہے، تاہم یہ جرم قتل کے مترادف نہیں۔

امام مالک کے مطابق، جو کچھ ایک عورت ضائع کرتی ہے ایک جمے ہوئے خون کے گچھے یا گوشت کے ایک لقمے کی صورت یا اس صورت میں ہو کہ جسے بچہ یا بچی (offspring) کہتے ہیں؛ مستقبل کا ایک ذی روح ہے اور اس ذی روح کے حرمتوں کو پامال کرنے کی پاداش میں اس پر غُرانا فذ ہو گا۔ امام غزالی جو شافعی مذہب کے پیروکار ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ، تخلیق کا پہلا مرحلہ اس وقت شروع ہو جاتا ہے جب مرد کا جنین مادّہ عورت کے رحم میں داخل ہوتا ہے، جسکے ساتھ ہی اس کے ایک زندہ چیز کی شکل تک اِرتقا کی تیاری شروع ہو جاتی ہے، اور اس سلسلے کو پامال کرنا یا خراب کرنا جُرم ہے۔

اِمام ابنِ حنبل کی فقہ کے مطابق، اگر کوئی عورت ایسے جنین کو ضائع کرتی ہے جس پر انسانی نقوش ظاہر نہیں ہوئے، تو اس صورت میں کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا، اس کے باوجود کہ اگر کوئی قابلِ اعتماد دائی گواہی دے کہ وہ جنین جس کا اسقاط ہوا وہ انسان کی ابتدائی تخلیق کی نشانیاں رکھتا تھا، اگر رحم میں رہنے دیا جاتا تو ایک انسان کی صورت میں وضع ہوتا، تو سب سے صحیح رائے یہ ہے کہ کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا۔ کیونکہ بنیادی حکم بے گُناہی کا ہے اور اس پر کسی گُمان کی بنا پر شک نہیں کیا جائیگا۔

اگر کوئی جنین میں روح پھونکے جانے سے قبل اسکے اِسقاط کو حق بجانب ثابت کرنے کا تصوّر کرے تو وہ دیکھے گا کہ اس میں تین قسم کے مفروضے ہیں:

Marfat.com

پہلا، اِسقاط خطرے یا حاملہ عورت کے حمل جاری رکھنے کی صورت میں اسکی صحت کے بارے میں کسی خوف یا اور کسی شرعی قانونی وجہ، جیسے کہ زنا بالجبر کی صورت میں ہو تو ایسے معاملات میں شریعت عذر کی وجہ سے اسقاطِ حمل کی رُخصت دیتی ہے۔

دوسرا، اسقاطِ حمل کا مقصد ضبطِ ولادت کی ایک احتیاطی تدبیر ہو، جیسے کہ خرچے اور معاشی دباؤ سے بچنے کی غرض سے۔ اس صورت میں اسقاطِ حمل ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ غُربت کے خوف سے قتلِ اولاد کے زُمرے میں آتا ہے[یہ غربت کا ڈر بچے کیلئے ہو یا والدین کیلئے]۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: "اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی دیں گے۔" (الانعام:151) اور؛ "اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو۔ ہم اُنہیں بھی رِزق دیں گے اور تمہیں بھی۔ در حقیقت ان کا قتل ایک بڑی خطا(جرم) ہے۔" (بنی اسرائیل:31)

تیسرا، اسقاطِ حمل اوپر بیان کی گئی دونوں وجوہات کے علاوہ اور کسی وجہ سے ہو، جیسے کہ ماں کی یہ خواہش کہ بچے کی پیدائش میں جتنا ممکن ہو تاخیر کی جائے، اپنی جوانی کو طول دینے کی غرض سے یا اپنے ظاہری روپ کو قائم رکھنے کی غرض سے یا بغیر بچے کو جنم دیئے لمبے عرصے تک اپنے شوہر کے ساتھ رہنے کی غرض سے اس گمان کے ساتھ کہ ایسا ہونے پر شوہر اسے طلاق دے سکتا ہے۔ اس قسم کی وجوہات سے اسقاطِ حمل جائز نہیں ہو گا۔

یہ جرح کی جاسکتی ہے کہ حمل کے 120 دن تک رحمِ مادر میں جو جما ہوا خون ہوتا ہے اس میں روح کے بغیر زندگی کی کوئی رمق نہیں ہوتی، لہٰذا، اس کے اِسقاط کی اجازت ہونی چاہیے۔ تاہم، وہ "طبعی مادّہ" ابتدائی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے، اور حقیقت میں ایک ذی حیات نفس ہوتا ہے، اگر یہ سوچا جائے کہ یہ مستقبل میں کیا بننے والا ہے۔ 120 دن کا عرصہ صرف ایک پیمانہ ہے تخلیق کی تکمیل اور اس میں روح پھونکے جانے کا۔ بہت سے اہلِ علم کی نظر میں ایک جنین جو 110 دن کا ہو اس میں اور ایک جو 120 دن کا ہو اس میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا۔

Marfat.com

حمل اللہ کی جانب سے اپنی مخلوق کیلئے ایک تحفہ ہوتا ہے۔ کوئی بھی اگر اس پر دست درازی کرے گا تو ایسے ہے کہ اس نے خدائے عظیم کے تحفے کو مُسترد کر دیا، تاہم در حقیقت یہ ایسے ہے کہ اس مرد یا عورت نے خدائے عظیم کی مرضی اور اسکی حِکمت کی مخالفت کی۔

مختصراً، یہ مقالہ اس نتیجے کا حامل ہے کہ، اِرادی طور پر اِسقاطِ حمل اِسکے باوجود کہ وہ حمل کے 120 دنوں کا عرصہ مکمل ہونے سے قبل ہی کیوں نہ ہوا ہو جائز نہیں۔ جو کوئی جان بوجھ کر کرتا ہے وہ گنہگار ہے، سوائے اس صورت میں جبکہ شرعی عذر موجود ہو۔

اسی جریدے کے ایک دوسرے مقالے میں زنا بالجبر کے نتیجے میں ہونے والے حمل کے اِسقاط کے سوال پر بحث کی گئی ہے۔[1] اس میں نتیجہ یہ نکالا گیا ہے کہ زنا بالجبر عورت کیلئے شدید نفسیاتی مسائل کا باعث ہوتا ہے اور مستقبل میں ان کی زندگی کیلئے کئی پیچیدگیاں پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا، یہ جرح کی گئی ہے کہ ایسی صورت میں عورت جلد از جلد اس بات کا تعیّن کرے کہ کیا وہ حاملہ ہے اور اگر اِسقاط کا فیصلہ ہو تو اُسے 120 دن کے عرصے میں ہی ہو جانا چاہیے۔[2] اگر کسی وجہ سے اس عرصے کے بعد تک حمل موجود رہا، تب بھی اُسے اشد ضرورت کے معاملے کے طور پر ہی لیا جائیگا، اسکی وجہ وہ نقصان ہے جو اسکے سبب عورت کو ہو سکتا ہے۔ تاہم، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ اگر زنا بالجبر کی آفت کی شکار عورت کی رضامندی حمل کو جاری رکھنے کی ہے تو اس میں عورت کیلئے کوئی نفسیاتی یا طبعی نقصاندہ چیز نہیں، اور اس صورت میں وہ اپنا حمل جاری رکھے گی اور انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اسے اس بات کی بڑی جزا دینگے کہ اس نے اس بچے کو پروان چڑھایا اور اس کی دیکھ بھال کی۔ شاید کہ وہ بچہ مستقبل میں اسکے لیے کوئی بڑی خوشخبری کا سبب بنے۔ واللہُ اعلم بالصواب۔

---

[1] "زنا بالجبر کی صورت میں اسقاطِ حمل کے قوانین،" Contemporary Jurisprudence Research Journal (17th edition, 5th year, Apr-May-June 1993), pp.77-82۔ غالباً یہی نتیجہ زنائے محرم کے معاملے میں بھی اخذ کیا جائے گا۔

[2] اس حدیث پر کی گئی بحث کے محاصل کی روشنی میں ترجیح اس کو دی جائیگی کہ یہ عمل جلد از جلد ہو۔

Marfat.com

مردہ جنین کی نمازِ جنازہ

علما کی اکثریت کے مطابق اگر اسقاطِ حمل کر دیا گیا یا ہو گیا اسکے بعد کہ اس میں روح پھونکی جا چکی تھی تو اس پر نمازِ جنازہ پڑھی جائیگی۔ یقیناً علما کی اکثریت یہ بھی کہتی ہے کہ روح کے پھونکنے کا عمل 120 دنوں کے بعد ہوتا ہے۔ لہٰذا، اگر ایک جنین 120 دنوں کے بعد ساقط ہوتا ہے، جنین کا جو بھی حصہ عورت میں سے نکل کر باہر آتا ہے تو اس کی مناسب طور سے تدفین کی جائیگی اور اس پر نمازِ جنازہ ادا کی جائیگی۔ ابنِ عثیمین کہتے ہیں کہ اگر جنین 120 دنوں سے قبل باہر آئے تو صرف ایک گوشت کا لوتھڑا سا ہوتا ہے اور اسے کہیں بھی زمین میں دفن کر دینا چاہیے، اسکے بغیر کہ غسل یا کفن کا اہتمام کیا جائے یا اس پر نماز ادا کی جائے۔ یہ انسان 120 دنوں کے بعد ہی بنتا ہے۔[1]

یوں سوچا جا سکتا ہے کہ اگر ایک عالم اس خیال کا حامی ہے کہ روح کے پھونکنے کا عمل 40 یا 45 دنوں کے بعد ہوتا ہے تو اگر اِسقاط اس عرصے کے بعد ہوا ہو اس کے مطابق نمازِ جنازہ پڑھی جائیگی۔

---

[1] ابنِ عثیمین، الشرح الممتع، جلد 5، ص ص۔ 374-373۔ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ 120 دن کے بعد، اصحابِ علم کے مطابق، جنین کو اس وقت کوئی نام دینا ضروری ہے۔ کسی دوسرے مقام پر عثیمین یہ بھی لکھتے ہیں کہ عقیقہ کا اہتمام بھی ایسے جنین کے لیے ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے والدین کے لیے شفاعت کرے، کیونکہ ایسے جنین کو یومِ قیامت دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ دیکھیں ابنِ عثیمین، شرح ریاض الصالحین، جلد 5، ص۔ 340 اسقاطِ جنین پر ان آخری دو نکات سے متعلق کوئی واقعہ حدیث میں موجود نہیں۔ واللہُ اعلم بالصواب۔ اس بارے میں ایک اور رائے یہ ہے کہ جنین میں روح کے پھونکے کا عمل چار ماہ اور دس دن کے عرصے کے بعد ہوتا ہے۔ اس صورت میں، جنین کے لیے نمازِ جنازہ صرف تب ہی پڑھی جائے گی جبکہ اسقاطِ چار ماہ اور دس دن کے عرصے کے بعد ہوا ہو۔ یہ رائے کہ روح چار ماہ اور دس دن کے بعد آتی ہے، وہ وجہ ہے جو بعض اہلِ علم اس پابندی سے منسلک کرتے ہیں جس کے تحت ایک بیوہ کو چار ماہ اور دس دن اپنے آپ کو نکاح سے روکے رکھتا ہے۔ دیکھیں ابنِ رجب، جلد 1، ص۔ 162۔

Marfat.com

بعض علما کے مطابق نمازِ جنازہ صرف اُسی صورت میں پڑھی جائیگی جبکہ ایک بچہ زندہ حالت میں باہر آئے اور روئے، چاہے وہ صرف ایک بار ہی ایسا کرے۔ یہ رائے بعض اوقات اس حدیث پر تکیہ کر کے دی جاتی ہے کہ،

اذا استهل الصبی صلی علیه۔

"اگر ایک بچہ روئے [چاہے ایک بار ہی]، اسکے لیے نماز پڑھی جائے۔" یہ حدیث نسائی وغیرہ نے محفوظ کی ہے۔ تاہم علمائے حدیث اس بات پر متفق ہیں کہ یہ ایک ضعیف حدیث ہے۔[1] صحیح البخاری میں یہ لکھا ہے کہ، الزہری کے مطابق کوئی صرف اسی صورت میں نمازِ جنازہ پڑھے گا جب کہ مرنے والا یا اِسقاطِ حمل کی صورت میں ضائع ہونے والا بچہ حقیقتاً روئے۔

اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ یہ تعیّن کرنا ایک مشکل امر ہے کہ کب جنین میں روح پھونکی جاتی ہے، تو اِسقاط کی صورت میں نمازِ جنازہ پڑھ لی جائے۔ یہ اس وقت جب ماں سے باہر آنے والی چیز کوئی ٹھوس مادّہ ہو کسی بہتے ہوئے خون کے بجائے، تو اس صورت میں نمازِ جنازہ پڑھی جاسکتی ہے۔[2] یہ رائے رسول اللہ ﷺ کی اسی حدیث کے مطابق ہے کہ،

السقط یصلی علیه ویدعی لوالدیة بالمغفرة والرحمة۔

---

[1] ابنِ حجر کے مطابق یہ سلسلہ ترسیل صحیح ہے لیکن مضبوط ترین رائے یہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا قول نہیں بلکہ صحابی جابرؓ کا قول ہے۔ دیکھیں ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص۔325۔

[2] یہ نقطۂ نظر اس مسئلے کو بھی حل کر دیتا ہے کہ اس بات کا تعیّن کیا جائے کہ در حقیقت حمل کو 120 دن گزر چکے ہیں۔ بعض اصحابِ علم کے مطابق یہ لازمی ہے کہ ایسے بچوں کے لیے نمازِ جنازہ ادا کی جائے البتہ اس کے پڑھ لینے میں کوئی حرج بھی نہیں اگر لوگ ایسا کرنا پسند کریں اس بارے میں اختلافی اخبار آئی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے نومولود بیٹے ابراہیم کی وفات پر نمازِ جنازہ پڑھی یا نہیں۔ الالبانی اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مضبوط ترین نقطۂ نظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے بیٹے ابراہیم کی نمازِ جنازہ نہیں ادا کی۔ واللہُ اعلم بالصواب۔ دیکھیں محمد ناصر الدین لا البانی، احکام الجنائز وبدعہ (بیروت: المکتب الاسلامی، 1986)، ص ص ۔79-80۔

Marfat.com

"ساقِط کیے جانے والے یا[ہو جانے والے] جنین پر نمازِ جنازہ پڑھی جائے، اور اسکے والدین کیلئے مغفرت اور رحمت کی دعا کی جائے۔"[1] اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے کہا السقط، اس لفظ سے پہلے الف اور لام کے ساتھ۔ اس سے عمومیت مراد ہے۔ یعنی اس کا اطلاق ہر ساقط شدہ جنین پر ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اِس جنین کو کسی خاص عمر کیلئے محدود نہیں کیا، نہ ہی اس میں رونے والی شرط عائد کی۔

اس حدیث سے متعلّق دیگر چند نکات

- انسانی تخلیق اور پیدائش کے پورے عمل کے بارے میں اگر ایک ذی عقل انسان غور کرے تو ایسا کرنا دوبارہ اٹھائے جانے اور زندگی بعد موت پر ایمان کی طرف اسکی رہنمائی کرے گا۔ وہ جو کہ پانی کی ایک بوند سے انسان کی تخلیق کرنے کی قدرت رکھتا ہے یقیناً یہ قدرت بھی رکھتا ہے کہ انسان کو اس کی موت کے بعد دوبارہ تخلیق کر دے۔
- اللہ یقیناً یہ قُدرت رکھتا ہے کہ انسان کو ان سارے مراحل سے گزارے بغیر ہی تخلیق کر دے جن سے وہ رحمِ مادر میں گزرتا ہے۔ ابنِ حجر کے مطابق اللہ تعالیٰ کا اس طریقے پر انسان کو تخلیق کرنا دراصل ماؤں کے لیے اسکی رحمت کا مظہر ہے۔ یہ طریقہ ان کے لیے آسانی کا باعث ہے جس میں انہیں کم سے کم صعوبت برداشت کرنا پڑتی ہے، اللہ تعالیٰ رحم کو تیار کرتا ہے اور بتدریج پیدائش تک کا فاصلہ آہستہ آہستہ طے ہوتا ہے۔[2]
- ایک انسان کو چاہیے کہ اپنی پیدائش پر غور کرے کہ کسطرح اُسے بتدریج ایک خوبصورت شکل میں وضع کیا گیا۔ اس کی تخلیق ایک بہترین صورت میں ہوئی اور ان

---

[1] اسے احمد، ابوداؤد، الترمذی اور الحاکم نے محفوظ کیا۔ الالبانی کے مطابق یہ صحیح ہے۔ الالبانی، صحیح الجامی، جلد 1، ص۔ 661۔

[2] ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص۔ 325۔

Marfat.com

سب سے بڑھ کر اسے دماغ عطا کیا گیا اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے نوازا گیا جو اسے دیگر حیوانوں سے ممتاز کرتی ہے جن کو یہ اوصاف عطا نہیں کے گئے۔ وہ جو اس نعمت کی قدر جانتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا سچا مشکور ہو گا، جس نے اُسے تخلیق کیا، اپنے فضل سے اُسے زندگی دی۔ اُسے چاہیے کہ اُسکا شکر مناسب طور پر ادا کرے اور وہ یہ ہے کہ اُسکی اطاعت کرے اور اُسکے احکام سے روگردانی نہ کرے۔[1]

- مزید یہ کہ اس حدیث سے ایک انسان کو یہ اندازہ کرنے میں مدد ملے گی کہ اس کو کتنی زیادہ اپنے ربّ کی مدد درکار تھی اور ہے۔ جبکہ وہ اپنی ماں کے رحم میں ایک مائع کی بوند تھا، وہ اپنے آپ کو خود وجود میں نہیں لایا بلکہ وہ اللہ ہے جس نے اسے تخلیق کیا۔[2] درحقیقت وہ انسان جو آج زندہ ہے اُسے اس بات کا کوئی اندازہ نہیں کہ وہ کن مراحل سے گزرا ہے۔ اُسے چاہیے کہ اس بات پر غور کرے کہ اللہ نے اُسکا کس طرح خیال رکھا اور کسطرح اسے ایک بہترین تخلیق کی صورت دی۔ یقیناً اسے اپنے خالق اور ربّ کا بے حد شکر گزار ہونا چاہیے۔[3]
- یہ حدیث اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک انسان اپنے اعمال کی بنا پر جنّت یا جہنّم میں داخل ہوتا ہے۔ یہ صورتِ حال اس حدیث سے اختلاف نہیں کرتی کہ "تم میں سے کوئی اپنے اعمال کی بنا پر جنّت میں داخل نہیں ہو گا۔" (البخاری و مسلم)۔ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ بجز اللہ تعالیٰ کے فضل اور رحم کے کوئی جنّت میں داخل نہیں ہوتا۔ صرف اسکے اعمال اسے اس کا حقدار نہیں بناتے کہ جو کچھ جنّت میں موجود ہے۔[4]

---

[1] ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص۔325۔

[2] آج کے کفار اسے "فطری عمل (Mother Nature)" کہیں گے۔ لیکن اللہ کے سوا وہ کون ہے جس نے فطری قوانین وضع کیے ہیں؟

[3] جیسا کہ، محمد السندی، شرح الاربعین النوویہ (دمام، سعودی عرب، رمادی للنشر، 1995)، ص۔39۔

[4] ابنِ حجر، فتح، جلد 13، ص۔326۔

Marfat.com

- جو کچھ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اور جو کچھ اس نے متعیّن کر دیا، وہ ہو کر رہے گا، اسکے اس علم کی وجہ سے جو حوادث کے وقوع ہونے سے قبل ہی موجود تھا، ہر ایک شخص اس کے حکم کے مطابق ہی جنّت یا جہنّم میں داخل ہو گا کیونکہ یہ اُسکا حکم ہے؛ یہ القدر پر ایمان کا ایک حصہ ہے۔ تاہم، یہ کسی کو معلوم نہیں کہ اس کیلئے کیا لکھ دیا گیا ہے۔ لہٰذا، ہر ایک کو اس کی محنت ضرور کرنی چاہیے جو اسکا ہدف ہے۔ اگر وہ اہلِ جنّت میں سے ہے تو اس سے مُناسبت رکھنے والے اعمال اس کے لیے آسان بن جائینگے اور وہ ایسے اعمال کو اپنی وفات تک جاری وساری رکھے گا۔
- اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ توبہ اور نیک اعمال پچھلی بد اعمالیوں کے بُرے اثرات کو زائل کر دیتے ہیں۔
- القاری لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ انسان کو چاہیے کہ چیزوں کو بتدریج لے اور بتدریج ان پر عمل درآمد کی روش اختیار کرے، قدم بہ قدم، ہر قدم اُسکے مُناسب وقت پر اٹھائے، جلد بازی سے احتراز کرتے ہوئے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ سے زیادہ اس بات کی قُدرت کسی میں نہیں کہ کسی چیز کو بھی ایک لمحے میں تخلیق کر دے، لیکن یہ اللہ کی سُنّت نہیں، انسانوں کو اس امر کی حِکمت کو سمجھنا چاہیے۔ اور اس بات کو جان لینا چاہیے کہ کسی چیز کے حصول و تکمیل کیلئے اُسے درست اور مناسب طریقے سے بتدریج پیش قدمی کرنی چاہیے۔[1]
- ایک مسلمان کو اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے کسی احمقانہ سوچ یا دھوکے میں نہیں رہنا چاہیے۔ اسکے اچھے اعمال اسے خود سر اور مغرور نہ بنادیں۔ اس قسم کے رُجحانات ایک سچّے مومن میں نہیں ہوتے جو کہ اس دنیا کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس ایک سچّا مومن ہمہ وقت ڈر اور اُمید کے درمیان زندگی بسر کرتا ہے۔ اسے ہر وقت یہ اُمید

---

[1] القاری، جلد 1، ص۔150۔

Marfat.com

ہونی چاہیے کہ اللہ اسکے اچھے اعمال کو قبول کرے گا اور مستقل اس کی ہدایت کا انتظام کرتا رہے گا۔، ساتھ ہی اس بات سے ڈرتے رہنا چاہیے کہ کہیں اسکے اعمال مقبولیت نہ پاسکیں یا وہ سیدھے راستے سے بھٹک جائے اور اسکے سارے اعمال اکارت ہو کر رہ جائیں۔[1]

- اس سے قطع نظر کہ کوئی شخص کس قسم کی بداعمالیوں اور کُفر کا مُرتکب ہوتا ہے، کسی دوسرے کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ رعونت سے یہ کہے کہ "فلاں شخص جہنّم میں جائے گا" جبکہ وہ ابھی زندہ ہے، اللہ تعالیٰ اسے سیدھے راستے کی طرف ہدایت فرماسکتے ہیں۔ مکمل طور پر اُسکی سمت تبدیل کرسکتے ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اہلِ جنّت میں سے ہو جائے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں کے متعلّق نااُمید نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اسلام قبول نہیں کریں گے۔ مثال کے طور پر کسی کی ماں یا باپ غیر مسلم ہیں اور ممکن ہے کہ وہ اس حالت میں ایک لمبے عرصے تک رہیں۔ اس شخص کو چاہیے کہ ان کی ہدایت کی دعا کرتا رہے اور مایوس نہ ہو، یہ عین ممکن ہے کہ اللہ ان کی موت سے قبل حق کی طرف انکی ہدایت کا سامان کردے۔
- ہر مسلمان کو اس بات سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے کہ اُسکی موت ایک بُری موت ہو۔ جس میں اپنی موت سے قبل ایک انسان کے اعمال اصحابِ نار والے اعمال ہو جاتے ہیں۔
- اللہ تعالیٰ نے ہمارے رِزق کو ہماری پیدائش سے قبل ہی متعیّن کر دیا ہے۔ اللہ ہی اکیلا رازق ہے۔ لہٰذا، ہمیں اس کی طرف ہی رزق کے لیے رُجوع کرنا چاہیے۔ ہر شخص کا رِزق لکھ دیا گیا ہے اور اس حکم کے مطابق وہ اس تک پہنچے گا۔ اسلیے اس بات کی کوئی

---

[1] جیسا کہ، القاری، جلد 1، ص۔152۔

Marfat.com

ضرورت نہیں کہ کوئی اپنے دین کو داؤ پر لگا کر اس دنیا میں رِزق کے حُصول کی تگ ودو کرے۔[1]

- النووی کے مطابق کسی معاملے پر زور دینے کی غرض سے تاکہ لوگ ضرور متوجّہ ہوں ،اللہ کی قسم کھانا مُستحب ہے۔[2] شاید ایسا کرنا جائز ہو۔
- اس حدیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ رحم میں روح کے پھونکنے کا عمل حمل کے ساتھ ہی نہیں ہوتا۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس معاملے میں اسلامی نقطۂ نظر کیتھولک(Catholic)نقطۂ نظر سے مختلف ہے۔

حدیث کا خلاصہ

- نطفہ کا لفظ اس حدیث میں نہیں آتا ان روایات کے مطابق جنہیں البخاری، مسلم اور کئی اور اصحاب نے قلمبند کیا۔ یہ لفظ صرف ابو عیینہؒ کی روایت میں ملتا ہے۔ یہ روایت ان ساری روایات سے مُتصادم ہے جنہیں کئی بااعتماد راویوں نے روایت کیا۔ لہٰذا، اسے ادراج کا معاملہ تصوّر کیا جائیگا، جس میں حدیث کے اصل متن میں غلط طور پر کوئی لفظ درج کر دیا جاتا ہے۔
- جمہورِ علما نے اس حدیث سے یہ اخذ کیا ہے کہ جنین نطفہ، علقہ اور مضغہ کے تین مراحل سے گزرتا ہے۔ ہر ایک مرحلہ 40 دنوں پر مشتمل ہوتا ہے اور یوں 120 دنوں میں یہ تینوں مراحل مکمل ہوتے ہیں۔ مُصنّف یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اسے اس رائے سے اختلاف ہے جو عام طور پر اس سوال کے بارے میں پائی جاتی ہے۔ حالانکہ ایسی مثالیں موجود ہیں، لیکن اسلام کے عظیم اہلِ علم سے اختلاف کرنا کوئی آسان بات نہیں۔

---

[1] سلطان، ص۔173۔

[2] یحییٰ النووی، شرح متن الاربعین النوویہ (جدہ: دار مجتمع، 1986)، ص۔50۔

Marfat.com

مُصنّف اللہ سے دعا گو ہے کہ اگر اس سے اس معاملے میں خطا ہوئی تو اللہ تعالیٰ اس سے درگزر فرمائیں اور درست راہ کی طرف ہدایت فرمائیں۔

- اس حدیث کی ایک دوسری تشریح جو کہ رسول اللہ ﷺ کی دیگر احادیث کے مطابق ہے اور جو کہ "طبّی حقیقت" بھی ہے، وہ یہ ہے کہ تینوں مراحل مکمل طور پر حمل کے تقریباً 40 دنوں بعد پورے ہو جاتے ہیں۔
- یہ بات کلّی طور پر واضح نہیں کہ جنین میں روح کب پھونکی جاتی ہے۔ یقیناً یہ کم از کم حمل کے 40 دنوں کے بعد پھونکی جاتی ہے۔ جمہورِ علما کے مطابق اور بعض کی رائے میں اس پر اجماع ہے، کہ یہ عمل 120 دنوں کے بعد ہوتا ہے۔ کچھ اور لوگوں کا خیال ہے کہ یہ 130 دنوں کے بعد ہوتا ہے۔ اس مُصنّف نے اس امر پر کوئی حتمی رائے قائم کرنے کی تگ و دو نہیں کی۔
- جبکہ انسان ابھی ایک جنین ہی ہوتا ہے اسکا رِزق، عمر، اعمال اور یہ کہ کیا وہ خوش قسمت ہو گا یا بد قسمت لکھ دیا جاتا ہے۔ اور یہ سب اللہ کے اس علم کا حصہ ہے جو وہ اپنی مخلوق کے بارے میں ان کی تخلیق سے قبل ہی رکھتا ہے۔
- وہ اعمال جو ایک شخص اپنی وفات سے عین قبل کر رہا ہوتا ہے، یہ متعیّن کرتے ہیں کہ وہ اہلِ جنّت میں سے ہے یا اہلِ نار میں سے۔
- کوئی شخص اپنے پچھلے اعمال پر تکیہ کر کے نہیں بیٹھ سکتا کہ یہ اسے جنّت میں لے جائینگے۔ بلکہ اس کو جدوجہد اور تگ و دو کرتے رہنا ہو گا کیونکہ سب سے اہم رویّہ وہ ہو گا جسے وہ اپنی موت سے عین قبل اپنائے گا۔ {اس حقیقت سے کون اختلاف کرے گا کہ موت کے وقت کا علم کسی انسان کے پاس نہیں اور یہ کسی بھی وقت وارد ہو سکتی ہے، لہٰذا ہمہ وقت اچھے اعمال کی جستجو اور محنت مطلوب ہے (مترجم)}

Marfat.com

- ممکن ہے کہ کوئی شخص اہلِ نار والے اعمال کرتا رہا ہو پھر اللہ اُسے اپنی رحمت سے اہلِ جنّت والے اعمال کی طرف ہدایت فرمائے۔ اسطرح وہ اہلِ جنّت میں سے ہو جائے۔ بد قسمتی سے اس کا اُلٹ بھی ممکن ہے، اور ایسا اُسی وقت ہی متعیّن کر دیا گیا ہے جبکہ وہ اپنی ماں کے رحم میں تھا۔

Marfat.com